اکتوبر ۱۹۵۹ء

رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۳۳۰

جلد ۵۳

عدد ۱

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن"

۵ - اے ذیلدار پارک، اچھرہ - لاہور پاکستان

سالانہ چندہ ۶ روپے

قیمت فی پرچہ ۱۰ آنے

خـــالی صفحـــه

ترجمان القرآن، لاہور

فہرست مضامین

جلد ۵۳	بابت اکتوبر سنہ ۱۹۵۹ء	عدد ۱

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن، اچھرہ، لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلم قوم کو اپنے دین سے برگشتہ کرنے اور اس کی متاع ایمان کی قیمت گرانے میں حکمراں قوم کی معاشی پالیسی اور مسیحی اداروں کی جارحانہ کارروائیوں کو بھی کافی دخل حاصل رہا ہے۔ لیکن اسے بحیثیت ایک ملت جو عظیم نقصان نظام تعلیم کی تبدیلی سے پہنچا ہے وہ سب سے زیادہ المناک اور افسوسناک ہے۔ اس سے اس قوم کے نوجوانوں کے فکر ونگاہ کے زاویے بدلے۔ سوچنے اور سمجھنے کے انداز میں تبدیلی پیدا ہوئی۔ معیار خیر وشر میں ایک نمایاں تغیر رونما ہوا۔ ایمان اور یقین کی جگہ ریب وتشکک نے لے لی۔ جو خوب تھا وہی بتدریج ناخوب ہو گیا اور ناخوب سراسر خوب بن گیا۔

دنیا کا ہر نظام تعلیم کسی خاص کلچر یا تہذیب کو پروان چڑھانے کے لیے معرض وجود میں آتا ہے اس لیے ہر زندہ قوم اپنے نظام تعلیم کو اس طریق سے مرتب کرتی ہے کہ اس سے اس کے نوجوانوں کی علمی وفکری ترقی ہو سکے اور جب بڑے ہو کر وہ ہنگامۂ حیات میں عملاً شریک ہوں تو اس بنیادی اور اساسی تخیل کی خدمت کریں جس پر ان کے قومی تشخص کا دارومدار ہے۔ اسی وجہ سے جب کسی قوم کا شیرازہ منتشر کرنا مقصود ہوتا ہے تو اس کے نظام تعلیم کو تبدیل کر دیا جاتا ہے۔ اور یہ تبدیلی بالکل تھوڑے عرصے میں پوری کی پوری قوم کو بانجھ بنا کر رکھ دیتی ہے۔ یہ ایک ایسی بدیہی حقیقت ہے جس پر دنیا کی ساری تاریخ گواہ ہے اور جس کے نتائج آج خود ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ آخر کیا وجہ ہے کہ یہ قوم جس کی حرارت ایمانی سے کبھی پوری انسانیت سرگرم عمل تھی آج ایک

راکھ کا ڈھیر بن کر رہ گئی ہے، وہ جس کے سوز یقیں نے عقل اور علم کو چار چاند لگائے، تہذیب کے گیسو سنوارے، تمدن کو ترقی کے آخری زینے تک پہنچایا، وہ خود آج بے روح انسانوں کی بھیڑ نظر آتی ہے یہ سب اس نئے نظام تعلیم کی کرشمہ سازی ہے

اسے ہماری بد قسمتی کے علاوہ اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ بعض لوگ اپنی سادگی سے ابھی تک یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ تعلیم کا ہر نظام مفید اور کار آمد ہی ہوتا ہے اور انگریز نے جو نظام تعلیم ہمارے اس ملک میں نافذ کیا ہے وہ چونکہ انگلستان میں مفید اور بہتر نتائج پیدا کر چکا ہے اس لیے یہ لامحالہ ہمارے لیے بھی تریاق کی حیثیت ہی رکھتا ہے اور ہماری ساری برائیوں کا واحد علاج ہے۔ اس لیے وہ بدلے ہوئے حالات کے پیش نظر جو نیا نظام تعلیم مرتب کرنے کے لیے بیٹھتے ہیں اس میں بعض مضامین کی کمی و بیشی تو کر دیتے ہیں مگر اس نظام کے بنیادی نقشہ میں قطعاً کسی تبدیلی کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ اس کا انداز قریب قریب وہی رہتا ہے جو اوّل روز سے انگریزی نظام تعلیم کا ہے

اگر ان حضرات کی تجاویز اور مشوروں پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ دراصل یہ لوگ ابھی تک اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ علم تو محض حقائق کی پردہ کشائی ہے اس لیے دنیا کی ہر قوم کو جو اپنے اندر زندہ رہنے کا داعیہ رکھتی ہے ان حقائق کے قبول کرنے میں کوئی چیز مانع نہ ہونی چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے چھوٹے بڑے "مصلحین" ہمیں برابر یہ مشورہ دیتے جارہے ہیں کہ ہم آگے بڑھ کر مغربی علوم و فنون کو حاصل کریں اور اس طرح اُن فوائد سے متمتع ہوں جو یورپ کو تقریباً تین سو سال سے حاصل ہو رہے ہیں۔ اگر خدا کا کوئی بندہ اس قوم کو یہ کہتا ہوا سنائی دیتا ہے کہ تم ان علوم کو بے شک حاصل کرو مگر یہ دیکھ لو کہ اس میں بہت کچھ زہر کی آمیزش بھی ہے۔ تو "مصلحین" کا گروہ فوراً اس کے درپے آزار ہو جاتا ہے اور اسے کٹھ ملا، ترقی کا دشمن، رجعت پسند کہہ کر نظر انداز کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

یہ لوگ علم وفضل کے بلند بانگ دعووں کے باوجود ابھی تک اس حقیقت کو سمجھنے سے قاصر ہیں کہ علم سے مراد صرف فطرت کے رازہائے سربستہ کی تلاش وجستجو نہیں بلکہ اس میں بہت سے دوسرے عناصر اور عوامل بھی شامل ہیں اور دنیا میں آج تک کوئی محقق ایسا نہیں گزرا جس نے محض حقائق جمع کرنے میں اپنی قوتیں صرف کی ہوں۔ انسان جب بھی حقیقت کی تلاش میں نکلتا ہے تو کبھی خالی الذہن ہوکر نہیں نکلتا بلکہ اپنے ساتھ فکر ونظر کا زادِ راہ لیکر آگے بڑھتا ہے۔ پھر وہ اس نظامِ تکوینی کے اندر اور اس کے پرے جب حقائق کا کھوج لگانے کی کوشش کرتا ہے تو وہ یونہی دیوانوں کی طرح ہر وادی میں بھٹکتا نہیں پھرتا بلکہ ایک منزل کو دیکھتے ہوئے اُس کی طرف نہایت سوچ سمجھ کر قدم اٹھاتا ہے اُن راستوں کا تعین کرتا ہے جو اُسے جلد از جلد اُس منزل تک لے جاسکیں اور اُن پگڈنڈیوں کو چھوڑ دیتا ہے جو اسے دوسری سمت میں لے جانے والی ہوں۔ حقائق کبھی بھی مقصود بالذات نہیں ہوتے بلکہ ان سے ہمیشہ انسانوں نے نشانِ راہ کا کام لیا ہے۔ اگر سائنس دان اور فلاسفہ اپنی جد وجہد کا محور صرف حقائق کا جمع کرنا ٹھہراتے تو یہ سارے علوم وفنون منتشر واقعات وحوادث کا طومار ہوتے۔ ان میں وہ نظم وترتیب ناپید ہوتی جو ان میں اب نظر آتی ہے۔ علم محض حقائق کا جمع کرنا نہیں بلکہ انہیں ایک سلک میں اس طرح منسلک کرنا ہے کہ ان میں ایک معنوی ربط پیدا ہو۔ اور اُن سے ہم ایک خاص نتیجہ تک پہنچ سکیں۔ ذہنی اور فکری آوارگی اور تحقیق وجستجو میں یہی بنیادی فرق ہے۔ حقائق کو جو چیز باہم مربوط کرکے ایک علم کی حیثیت دیتی ہے وہ ترتیب وتدوین ہی ہے۔ چنانچہ دیکھیے کہ مختلف نظریات رکھنے والے انسانوں نے قریب قریب ایک قسم کے واقعات سے کس طرح مختلف نتائج مرتب کیے ہیں۔

تاریخ انسانی میں واقعات کی جو مختلف داستانیں بکھری پڑی ہیں انہیں دیکھ کر ایک انسان یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ قوموں کے عروج وزوال میں انسانی بنیادی اخلاق ایک فیصلہ کن قوت ہے جب قومیں اپنے آپ کو ایک خاص قسم کے اخلاق سے متصف کر لیتی ہیں تو انہیں ترقی حاصل

ہوتی ہے اور جب ان میں بداخلاقی آجاتی ہے، جب اُن میں عیش و عشرت کا دَور دورہ ہوتا ہے تو وہ تنزل کی آغوش میں چلی جاتی ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے یہ مفکر قوموں کے عروج و زوال کو اخلاقی ترقی اور انحطاط کی تاریخ قرار دیتا ہے

ایک دوسرا صاحبِ فکر انہیں واقعات کو اس طریق پر ترتیب دیتا ہے کہ تاریخ کا ارتقاد ذرائع پیداوار کی گردش نظر آتا ہے۔ وہ تاریخی حقائق سے یہ ثابت کرتا ہے کہ دنیا میں کوئی قدر معروضی اور ازلی و ابدی نہیں بلکہ یہ سب طریقِ پیدائش کی کرشمہ سازیاں ہیں۔ جب دولت پیدا کرنے کے طریقے تبدیل ہوتے ہیں تو پوری انسانی زندگی میں ایک انقلاب آتا ہے۔ ساری اقدارِ حیات بدل جاتی ہیں اور زندگی کے سارے شعبے ایک دوسرے سانچے میں ڈھلنے لگتے ہیں۔ ایک معاشی نظام، جو در حقیقت ایک خاص قسم کے طریقِ پیدائش کا ہی مظہر ہے، صرف ایک زمانہ تک تو انسانی ضروریات و حاجات کی کفالت کرتا ہے مگر کچھ عرصہ کے بعد اس نظام کے اندر سے اس کی مخالف قوتیں ظاہر ہوتی ہیں جو اس نظام کی تخریب و شکست کے درپے ہو جاتی ہیں۔ پھر ان دونوں کے مابین تنازع شروع ہو جاتا ہے۔ اس تنازع کے نتیجہ کے طور پر ایک نیا معاشی نظام وجود میں آتا ہے۔ لہٰذا تاریخ کے میدان میں جو لڑائیاں لڑی جاتی ہیں وہ اس دنیا میں ایک معاشی نظام اور اس کے مخالف نظام کے درمیان وقوع پذیر ہوتی ہیں۔ اخلاق و مذہب، علوم و فنون اور تمدن و معاشرت سب کے سب ابن الوقتوں کی طرح اپنے زمانے کے غالب معاشی نظام کے رنگ میں رنگے جاتے ہیں۔

اسی طرح ایک تیسرے صاحب اٹھتے ہیں اور اس بات کو ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ زندگی کے مادی کارخانے میں تخریب و تعمیر کا جو ہنگامہ برپا ہے۔ بگاڑ اور بناؤ کا جو فلم دکھایا جا رہا ہے، زوال و کمال کا جو کھیل کھیلا جا رہا ہے ان سب کے پیچھے روحِ مطلق اپنا کام کرتی ہے۔ عالمِ خارجی بذاتِ خود کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ اس کی اہمیت صرف اتنی ہے کہ وہ روحِ مطلق کے سفرِ ارتقا کے لیے نشانِ منزل کا کام دیتا ہے۔

ایک اور صاحب آتے ہیں اور تاریخی شواہد سے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ تاریخی ارتقا تحدی (چیلنج) اور اس کے جواب میں انسان کے ردِ عمل کا نتیجہ ہے۔

اس مقام پر پہنچ کر انسان کے دل میں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ تاریخ جب محض ماضی کے واقعات و حادثات کا مجموعہ ہے تو پھر فلسفۂ تاریخ کے ان نظریات میں اتنا اختلاف کیوں نظر آتا ہے؟ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ اگرچہ دنیا کے ہر مفکر نے اپنے دلپسند نظریہ کی تشکیل میں انہی واقعات و حوادث پر انحصار کیا ہے جو تاریخِ انسانی کا مشترک سرمایہ ہیں مگر ہر ایک نے اس تاریخی مواد کو اپنی نظر سے دیکھا ہے، اپنے ذہن سے ترتیب دیا ہے، اور اس سے وہ نتائج اخذ کیے ہیں جو اس کے اپنے طرزِ فکر سے مناسبت رکھتے تھے۔ اختلاف ان میں جو کچھ ہے وہ حقائق کا نہیں بلکہ ترتیب و تعبیر اور استنتاج کا ہے۔

یہ معاملہ صرف معاشرتی علوم تک ہی محدود نہیں بلکہ ترتیب و تدوین کے ہمہ گیر اور دور رس نتائج ان علوم میں بھی نمایاں طور پر نظر آتے ہیں جن کا تعلق قوانینِ فطرت سے ہے اور جن میں اختلاف کی بظاہر بہت کم گنجائش معلوم ہوتی ہے۔ آپ علم طبیعیات کو ہی لیجیے اور دیکھیے کہ دو مختلف ذہن رکھنے والے افراد انہیں قوانین سے دو بالکل متضاد نتائج اخذ کرتے ہیں۔ ایک آدمی قدرت کے مختلف مظاہر میں جب ہم آہنگی دیکھتا ہے تو اس سے فوراً اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ اس کائنات کے پیچھے ایک مدبر کی تدبیر کام کر رہی ہے اور یہ کائنات ایک نقشے اور پلان کے مطابق تخلیق ہوئی ہے۔ اس میں جو کچھ موجود ہے وہ سب کسی علت کا نتیجہ ہے اور سب سے بڑی علت خود اللہ رب العالمین ہے۔ یہ سارا کارخانۂ قدرت اپنے اندر ایک گہرا مقصد رکھتا ہے اور اس لحاظ سے انسان اندھی اور بے مقصد قوتوں کے ہاتھ میں ایک بے بس کھلونا نہیں بلکہ ایک صاحبِ مشیت و ارادہ ہستی ہے جو ان قوتوں سے جس طرح چاہے کام لے سکتی ہے۔

ایک دوسرا مفکر انہی مظاہرِ قدرت سے یہ نتیجہ برآمد کرتا ہے کہ ہماری اس کائنات میں جو ربط دکھائی دیتا ہے وہ فطرت کے قانونِ یکسانیت (LAW OF UNIFORMITY) کی کرشمہ سازی ہے۔ مادہ ہی کے اندرونی قوانین نے اس کائنات کے مختلف اجزا کے درمیان ایک ہم آہنگی پیدا کی ہے۔ اس عالم کے وجود کے لیے کسی بلند و بالا ہستی یا ذاتِ باری کی کارفرمائی کا یقین ضروری نہیں کیونکہ یہاں علتِ اولیٰ خود مادہ ہی ہے۔ اس کے سوا انسان کو کچھ معلوم نہیں، نہ معلوم ہو سکتا ہے۔ یہ عالمِ رنگ و بو کسی خدائی منصوبہ یا کسی بالاتر ذہن و شعور کی مصلحتوں کا نتیجہ نہیں اور نہ کوئی قوتِ حیات ہی ایسی موجود ہے جو اس مادہ پر کسی قسم کا اثر ڈال سکے۔ پھر انسان خود اس کائنات میں ایک عارضی اور اتفاقی شے ہے جسے فطرت کی اندھی بہری قوتوں نے خلق کیا ہے۔ وہ بے شک اپنے آپ کو کائنات کا مرکز تصور کرتا ہے مگر یہ محض اُس کی ابلہ فریبی ہے۔

غور کیجیے، کائنات کے موجود حقائق وہی ہیں، اس کے اندر کام کرنے والے قوانین بھی یکساں ہیں، مگر اس کے باوجود انہی کے مشاہدے سے یہ دو متضاد نتائج آخر کس طرح اخذ کیے جا رہے ہیں۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ ان کی ترتیب چونکہ دو مختلف فکری بنیادوں پر کی گئی ہے اس لیے اُن کے نتائج بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔

ہماری ان گزارشات سے یہ حقیقت منکشف ہو گئی ہو گی کہ علوم و فنون کے اندر اصل اہمیت حقائق کی نہیں بلکہ اُس بنیادی نقطۂ نظر کی ہے جس کے مطابق انہیں مرتب کیا جاتا ہے۔ بدقسمتی سے ہم کو انگریزی نظامِ تعلیم نے مغربی علوم سے صرف حقائق ہی نہیں دیئے بلکہ وہ بنیادی نقطۂ نظر بھی دے دیا جس کے تحت وہ مرتب کیے گئے تھے۔ اب دیکھ لیجیے کہ پچھلے ڈیڑھ سو برس میں ہم نے ان مغربی علوم و فنون کے حاصل کرنے میں جو قوتیں اور صلاحیتیں صرف کی ہیں اُن سے ہم کو بحیثیت مجموعی کیا فائدہ پہنچا ہے۔ پوری قوم ان علوم کو پڑھنے کے بعد ایک شدید قسم کے ذہنی انتشار میں مبتلا ہو گئی۔ ہمارے نوجوان ایک طرف تو ان تصورات کو بالکلیہ ترک کر دینے کے لیے تیار نہیں ہوتے جو

انہیں ماضی سے ایک مقدس ورثہ کے طور پر ملے ہیں اور دوسری طرف ہمارے مدارس اور کالجوں سے وہ ایسے افکار سے متاثر ہوتے رہتے ہیں جو ان تصورات کی بالکل ضد ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ علوم و فنون بجائے انہیں کسی قسم کا فائدہ پہنچانے کے انہیں ایک سخت قسم کی ذہنی کشمکش میں گرفتار کر دیتے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہی چیز موجودہ نظامِ تعلیم میں سب سے زیادہ ضرر رساں ہے۔ ہم اپنے ہاں جو ایک ذہنی خلفشار اور افلاس دیکھتے ہیں وہ اسی مغربی نظامِ تعلیم کا نتیجہ ہے۔ اس نے ہماری قوم کو فکری طور پر بالکل مفلس بنا کر رکھ دیا ہے۔ چونکہ میرا تعلق برسوں سے اس نظامِ تعلیم کے ساتھ چلا آ رہا ہے اس لیے میں اس کے مہلک اثرات سے بھی پوری طرح واقف ہوں۔ میں نے طلبائے کے مختلف طبقات میں گھوم پھر کر اس کے نتائج سے واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ آج تک جتنے طلبائے سے میرا سابقہ پڑا ہے انہیں مندرجۂ ذیل تین طبقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

ایک بہت بڑی تعداد اُن طلبا کی دیکھنے میں آئی ہے جو اس زندگی اور اس کے مسائل کے متعلق کسی سنجیدہ غور و فکر کے قطعاً عادی ہی نہیں رہے۔ اُن کی حیثیت بالکل جانوروں کی سی ہے جن کے سامنے بجز "چارے" کے کوئی دوسرا مقصد نہیں ہوتا۔ چونکہ یہ لوگ سوچ بچار کی زحمت ہی گوارا نہیں کرتے اس لیے ان کے ذہن ہر قسم کی کشمکش سے محفوظ رہتے ہیں۔ مغربی نظامِ تعلیم نے اس طبقے کو پوری طرح بیکار بنا دیا ہے اور ان سے سوائے اپنے پیٹ کے کسی دوسری خدمت کی توقع رکھنا بالکل عبث اور بیکار ہے۔

دوسرا طبقہ ایسا ہے جو مغربی علوم و فنون پڑھتا تو ہے لیکن ان کے بارے میں سوچتا بہت کم ہے مگر جونہی ان علوم کے اثرات اُس کے ذہن پر مرتب ہونے شروع ہوتے ہیں تو وہ خواہ اس کا زبان سے اقرار کرے یا نہ کرے۔ اس کا یقین بہر حال متزلزل ہوتا جاتا ہے اور وہ زندگی کے معاملات سے بالکل "شریفانہ" طور پر بے تعلق ہو جانے ہی میں اپنی عافیت سمجھتا ہے۔

تیسرا طبقہ وہ ہے جسے اسلام کے بنیادی نظریات و تصورات سے گہری عقیدت و وابستگی ہوتی ہے۔ وہ مغربی افکار کو باطل سمجھتا تو ہے مگر اس کے معاملہ میں مصیبت یہ پیش آتی ہے

کرنا تو درکنار نہیں باطل ثابت کرسکتا ہے اور نہ اسلام کے متعلق کوئی مثبت علم رکھتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ مغربی علوم سے بہت حد تک مرعوب ہوجاتا ہے اور اسلام کے اساسی تصورات کو ان کے مطابق ڈھال کر اُس تضاد کو دُور کرنے کی کوشش کرتا ہے جو اُس کے اپنے دلپسند نظریات اور مغربی افکار کے درمیان پایا جاتا ہے۔ مگر جب کسی نقطہ پر ان دونوں کے درمیان تطبیق کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تو وہ اسلامی تصورات کو "ملّا" کی اختراع کہہ کر بڑی بے باکی سے رد کردیتا ہے۔

میں نے دین کے لیے قابلِ رشک حمیت رکھنے والے طلبا میں بھی اس ذہنی انتشار کی جھلکیاں دیکھی ہیں اور محسوس کیا ہے کہ یہ لوگ اسلام سے محبت رکھنے کے باوجود اُس سوزِ یقین سے خالی ہیں جو ایک مسلمان کا طرۂ امتیاز ہے اور جس کے بغیر عمل کی تڑپ پیدا نہیں ہوسکتی۔ ان بیچاروں کی ساری قوتیں اسی ذہنی کشمکش کی نذر ہوجاتی ہیں، اور وہ دینِ حق کے لیے بڑی مقدس آرزوئیں اور تمنائیں رکھنے کے باوجود اس کی کوئی خدمت نہیں کرپاتے۔

عمر کے اس دور میں جب ذہن ناپختہ ہو، جب فکری صلاحیتیں پوری طرح پروان نہ چڑھ چکی ہوں، جب انسان کا دماغ باہر کے اثرات قبول کرنے کے لیے بالکل تیار رہتا ہو، اس وقت اگر زندگی کے واقعات و حوادث یا مظاہرِ کائنات کے متعلق کوئی نقطۂ نظر ایک شخص کے دل و دماغ میں بٹھا دیا جائے تو پھر اُسے تبدیل نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے اثرات عمر بھر قائم رہتے ہیں۔ پھر اُس شخص کی ساری زندگی اپنے اسی نظریے کی توجیہ و تعبیر میں گزرتی ہے۔ وہ ہر آن اسی کوشش میں مصروف رہتا ہے کہ اسلامی تعلیمات کی کوئی ایسی تعبیر ہوسکے جس سے اُس کا بنیادی تصور میل کھاتا ہو۔

مثال کے طور پر آپ دیکھیے کہ مغربی نظامِ تعلیم میں ہم جو مضامین بچوں کو پڑھاتے ہیں اُن سے بحیثیتِ مجموعی اُن کے دماغ پر یہ اثر مرتب ہوتا ہے کہ یہ کائنات اور اس کی ہر شے تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ اس کے اندر کوئی چیز بھی ایسی نہیں جسے سکون اور قرار نصیب ہو۔ اس نظریے میں ایک جزو بلاشبہ صداقت کا بھی ہے لیکن اس سے ہمارے نوجوان کو جس نتیجہ تک پہنچایا جاتا ہے وہ یہ ہے

کہ زندگی کے خارجی مظاہر بدل جانے سے اخلاقی اقدار بھی تبدیل ہو جاتی ہیں اس لیے اس زندگی میں کسی ابدی قدر یا کسی حتمی اصول کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اب وہ نوجوان جو ذرا جری اور بیباک ہوتے ہیں وہ صاف طور پر کہہ دیتے ہیں کہ اسلام ایک وقتی تحریک تھی جس نے اپنے زمانے میں انسانیت کی بہت بڑی خدمت کی لیکن اب ان بدلے ہوئے حالات میں اس کی قطعاً کوئی افادیت باقی نہیں رہی۔ اس کے مقابلے میں وہ لوگ جو اسلام کو چھوڑنا نہیں چاہتے وہ خود اُ قرآن مجید میں سے اس نظریہ کی تائید میں کوئی عبارت تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور عام طور پر سورۃ الرحمٰن کی یہ آیت کُلَّ یَوْمٍ ھُوَ فِیْ شَاْنٍ ہی استعمال ہوتی ہے۔ پھر نئے افکار و نظریات کے قبول کرنے میں اگر کوئی چیز مانع نظر آتی ہے تو اسے دور کرنے کے لیے یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ اسلام میں اجتہاد کا دروازہ تو قیامت تک کھلا ہوا ہے اس لیے ہمیں اپنے حالات کے مطابق ان مسائل کے بارے میں سوچنا چاہیے۔ انہی میں سے ایک گروہ ایک قدم اور بڑھا کر یہ دعویٰ کرتا ہے کہ مرکزِ ملت کو اس امر کا اختیار حاصل ہے کہ وہ وقت کے تقاضوں کے پیشِ نظر دین میں جو تبدیلیاں چاہے کرے اور یہی اسلام ہے۔

باقی رہی وہ نہایت قلیل سی تعداد جس کی طبیعت اس قسم کی توجیہات پر مائل نہیں ہوتی اس کا حال بھی اس طبقہ سے کچھ زیادہ مختلف نظر نہیں آتا۔ وہ اپنے ایمان کی عافیت اسی میں سمجھتی ہے کہ دنیا اور اس کے مسائل سے بالکل آنکھیں بند کرے اور زندگی کے دن اس طریق سے گزارے گویا کہ یہاں کوئی ایسا مسئلہ ہی نہیں جو اس کی توجہ کا محتاج ہو۔ اس طبقہ کی آخری پناہ گاہ تصوف ہے اور متصوفانہ خیالات کے اتھاہ سمندر میں ہی ایک مدت گم رہ کر اس طبقہ کے لوگ اپنے خالق اور مالک سے جا ملتے ہیں۔ اس کارگہِ حیات میں یہ حضرات کبھی شریک نہیں ہوتے اور یہاں بالکل غیر متعلق تماشائیوں کی سی زندگی بسر کرتے ہیں۔ وہ اپنی ذات میں خواہ کتنے نیک اور پاکباز ہوں مگر انسانیت ان سے قطعاً کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتی۔ جبر و استبداد یہاں کھلے بندوں پھرتا ہے مگر انہیں اس کے روکنے کی کبھی فکر لاحق نہیں ہوتی۔

یہ ہیں وہ عملی نتائج جو مغرب کے صرف ایک نظریہ کو قبول کر لینے سے ایک مسلمان نوجوان کے ذہن پر مرتب ہوتے ہیں۔ اور جب پوری قوم کو اسی قسم کے باطل نظریات پر پالا جائے تو اس قوم کی حالتِ زار کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس مغربی نظامِ تعلیم نے ہمارے ذہنوں کے اندر جو انتشار اور خلفشار پیدا کر رکھا ہے اُس نے ہمیں کسی کام کا نہیں چھوڑا اور یہی دراصل وہ عظیم نقصان ہے جو ہمیں اس نظامِ تعلیم سے پہنچا ہے۔

اب اگر ہم اصلاحِ حال کرنا چاہتے ہیں تو اس کی صورت یہ نہیں کہ ہم چند مضامین میں تغیر و تبدل کر دیں یا مغربی علوم و فنون کے ساتھ اسلامیات کے اجزا بڑھا دیں۔ بلکہ اس کی صحیح صورت یہ ہے کہ مغرب نے جن حقائق کو اپنے باطل نظریات کے مطابق مرتب کیا ہے انہیں ہم اس کے نظامِ فکر سے الگ کر کے اسلامی نقطۂ نظر کے مطابق پھر سے مرتب کریں۔ یہ کام مشکل تو ہے مگر محال نہیں۔ آخر ہمارے اسلاف نے بھی تو کائنات کے انہی مظاہر اور حوادث کو ترتیب دیکر اپنے علوم و فنون اس طرح مدوّن کیے تھے کہ وہ اسلام کی بنیادی حقیقتوں سے ہم آہنگ ہو گئے تھے۔ انہی حقائق کے مطالعہ سے اُن کے اندر وہ عزم اور یقین پیدا ہوتا تھا جسے دیکھ کر پہاڑ بھی ندامت سے جھک جاتے۔ جب تک ہم یہ کام نہیں کرتے مسلمانوں کے اندر ایمان کی حرارت اور عمل کی تڑپ کبھی پیدا نہیں ہو سکتی۔

ہماری ان گزارشات کو دیکھ کر ممکن ہے کوئی صاحبِ فکر یہ کہیں کہ جب اس مغربی نظامِ تعلیم سے ہندوستان کی دوسری اقوام خصوصاً ہندوؤں نے بے پناہ فائدہ اٹھایا ہے تو مسلمانوں کو اس سے کیونکر نقصان پہنچ سکتا ہے۔ اس اعتراض میں جو منطقی مغالطہ موجود ہے اُسے ہر وہ شخص بآسانی محسوس کرتا ہے جو ہندومت اور اسلام کے مزاج سے کچھ بھی واقفیت رکھتا ہو۔ اسلام ایک ہمہ گیر نظامِ حیات ہے جو زندگی کے سارے گوشوں پر پوری طرح حاوی ہے۔

اس وجہ سے جب کسی مسلمان پر فکر و عمل کا کوئی باطل نظام مسلط کیا جاتا ہے تو وہ قدم قدم پر اپنے آپ کو ایک شدید کشمکش سے دوچار پاتا ہے۔ ہمارا نوجوان اس گئی گزری حالت میں بھی اتنا تو ضرور جانتا ہے کہ اسلام نے زندگی کو اخلاقی اقدار پر استوار کیا ہے مگر جب وہ کالج میں داخل ہو کر علم معیشت پر اپنے استاد کی پہلی تقریر سنتا ہے تو اس وقت اُس کے کان میں یہ بات پڑتی ہے کہ معاشیات کا اخلاق سے قطعاً کوئی تعلق نہیں۔ دولت کمانا اور صرف کرنا زندگی کا ایک الگ شعبہ ہے اور روحانی اور اخلاقی اقدار ایک دوسرے شعبۂ زندگی سے تعلق رکھتی ہیں۔ اسی بنیادی تصور پر اُسے معاشیات کی ساری تعلیم دی جاتی ہے اور جلد وہ وقت آجاتا ہے کہ اسلام سے محبت کے باوجود وہ اسے ایک ناقابلِ عمل چیز یا قصۂ پارینہ سمجھنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے۔

اسی طرح سیاست میں جو نقطۂ نظر اُسے اسلام دیتا ہے وہ اس نقطۂ نظر سے قطعاً مختلف ہے جس سے اسے ان مغربی طرز کے مدارس اور کالجوں میں روشناس کیا جاتا ہے۔ اسلام نے مملکت کے معاملے میں جو تعلیم اُسے دی ہے وہ یہ ہے کہ مملکت ایک انسانی ادارہ ہے جو محض انسانوں کی خدمت کے لیے وجود میں آتا ہے۔ وہ مقصود بالذات نہیں۔ یہ اعتباری اور مجازی طور پر مقتدر ہے اس لیے اس میں الوہیت کی شان پیدا نہیں ہو سکتی۔ امر و اقتدار سوائے خدا کے کسی کو حاصل نہیں جو ازلی و ابدی اور واجب بالذات ہے۔ مگر درسگاہوں میں مملکت کے مسئلے پر اُسے یہ تعلیم ملتی ہے کہ مملکت ہر قسم کی اخلاقی پابندیوں سے آزاد ہے۔ وہ اپنی ذات میں خود ایک خدا ہے اس لیے افراد کا فرض ہے کہ وہ اس کی خاطر اپنے آپ کو بالکل مٹا ڈالیں، وہ اگر جئیں تو اسی کی چاکری کے لیے اور مریں تو اسی کے آستانہ پر۔

یہی حال فلسفہ، اخلاق، معاشرت، شہریت، تاریخ اور دوسرے علوم کا ہے! اسلامی تصورات اور مغربی تصورات میں اتنا بُعد ہے کہ اُن دونوں کو کبھی یکجا نہیں کیا جا سکتا

اس حقیقت کا خود اُس قوم کے اصحابِ فکر تک نے اعتراف کیا ہے جو ہم پر انگریزی

نظامِ تعلیم مسلط کرنے کی شدید آرزومند تھی۔ مسٹر ریلی جو حکومتِ ہند کے امورِ داخلہ کے سکرٹری تھے انھوں نے واشگاف الفاظ میں یہ کہا:

"اس میں قطعاً کوئی تعجب کی بات نہیں کہ مسلمان اس طریقۂ تعلیم سے احتراز کرتے ہیں جو اگرچہ فی نفسہٖ کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو مگر اُن کے ملی رجحانات کو قطعاً خاطر میں نہیں لاتا۔ درحقیقت اس سے اُن کے ضروری سے ضروری تقاضے بھی پورے نہیں ہوتے یہ طرزِ تعلیم لازماً اُن کے مفاد کے خلاف اور اُن کی ملی روایات کے منافی ہے۔"

اسی طرح مشہور انگریز ڈبلیو۔ ڈبلیو۔ ہنٹر بھی اسی موضوع پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"حقیقت یہ ہے کہ ہمارا طریقۂ تعلیم جس نے ہندوؤں کو اُن کی صدیوں کی نیند سے بیدار کیا اور اُن کے کاہل عوام میں قومیت کے شریفانہ احساسات پیدا کر دیئے ہیں مسلمانوں کی روایات کے بالکل خلاف اور اُن کی ضروریات کے بالکل غیر مطابق ہے بلکہ ان کے مذہب کی تحقیر کرتا ہے۔"

ایک دوسرے مقام پر انگریزی نظامِ تعلیم کے بارے میں مسلمانوں کے معاندانہ طرزِ عمل کی ہنٹر وجہ بھی بیان کرتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اُس نے اس مسئلہ کا جس صحیح انداز سے تجزیہ کیا ہے وہ بڑا ہی قابلِ قدر ہے اور اپنے اندر غور و فکر کے بے شمار پہلو رکھتا ہے۔ وہ کہتا ہے:

"اکثر انگریزوں کی یہ عادت بن چکی ہے کہ وہ مسلمانوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ وہ اس بات پر غضبناک ہوتے ہیں کہ مسلمان اس تعلیم کو ٹھکراتے ہیں جسے ہم ایک ایک شخص تک پہنچانے کی ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں۔ پھر جس آسانی کے ساتھ ملک کی دیگر اقوام نے اس تعلیم کو اپنانے پر رضامندی کا اظہار کیا ہے اس کو دیکھتے ہوئے مسلمانوں کا انکار انگریز کو اور بھی برافروختہ کر دیتا ہے۔ چونکہ ہندو اس نظامِ تعلیم کے متعلق اپنے دل میں کوئی خلش محسوس نہیں کرتا لہٰذا ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر مسلمان کیوں خواہ مخواہ اپنے لیے تکلیف کا سامان پیدا کر رہے ہیں۔ دراصل ہم نے اس امتیاز کو بالکل

نظر انداز کر دیا ہے جو بذاتِ خود اتنا ہی پرانا ہے جتنا کہ انسان کا مذہبی رجحان ——
وہ امتیاز جس نے ہر زمانہ اور ہر قوم میں خدائے واحد کی پرستش کرنے والوں کو مشرکین سے جدا رکھا۔ مشرک اپنی پرستش کے لیے بہت سے معبود رکھتے ہیں اور اس بنا پر ان کے اعتقادات کے بھی کئی ایک حصے ہو جاتے ہیں۔ گبن نے یونانیوں کے متعلق جو آخری فیصلہ کیا تھا وہ اس وقت ہندوؤں پر کہیں زیادہ ٹھیک عائد ہوتا ہے۔ ناقابلِ تقسیم اور باضابطہ اعتقاد کی بجائے جو معتقدین کے اعتقاد پسند دل و دماغ پر کلیتہً حاوی ہو جائے، یونانی علم الاصنام کی بناوٹ ہزار ہا قسم کے آزاد اور لچکدار حصّوں کا ایک مجموعہ ہے۔ لہٰذا ان معبودوں کی پرستش کرنے والوں کو بھی اپنے مذہبی اعتقاد کی گہرائی اور درجے مقرر کرنے کی پوری پوری آزادی حاصل ہے۔ لیکن مسلمانوں کے لیے اس قسم کی آزادی ناممکن ہے۔ مذہب اُن سے غیر مشروط، سرگرم اور بے لچک اعتقاد کا خواہاں ہے۔ لہٰذا جو طریقِ تعلیم اُن کے مذہبی اصولوں کو نظر انداز کرے کسی سچّے مسلمان کو مطمئن نہیں کر سکتا۔

ہنٹر صاحب نے مسلم اور غیر مسلم کے بنیادی نقطۂ نظر میں جو فرق ہے اُس کی بالکل صحیح نشاندہی کی ہے۔ ایک مسلمان چونکہ زندگی کا ایک خاص نقطۂ نظر اور ایک متعین اسلوبِ حیات رکھتا ہے اس لیے یہ ناممکن ہے کہ وہ مسلمان رہتے ہوئے اپنی انفرادی یا اجتماعی زندگی کے کسی گوشہ میں کوئی ایسی چیز اصولاً گوارا کرے جو اُس کے اساسی تخیل سے متصادم ہو۔ اس کے برعکس ہندو کے نزدیک مذہب چونکہ خالق و مخلوق کے مابین ایک پرائیویٹ رشتہ ہے اس لیے حیاتِ انسانی کے ایک مختصر سے گوشہ کو چھوڑ کر وہ زندگی کے باقی شعبوں میں ہر قسم کے اصول و نظریات قبول کرنے پر بڑی آسانی سے آمادہ ہو سکتا ہے۔ یہی وہ اصل سبب ہے جس کی بنا پر مسلم قوم کے بہی خواہوں نے انگریزی نظامِ تعلیم کی مخالفت کی تھی۔ وہ ترقی کے دشمن نہ تھے۔ انہیں مغربی علوم و فنون سے بھی کوئی پرخاش نہ تھی، انہیں انگریزی زبان سے بھی بحیثیت ایک زبان کے کوئی نفرت نہ تھی۔ وہ اگر مخالف تھے تو اس بات

رکھے تھے کہ اس نظامِ تعلیم کو جوں کا توں اپنا لیا جائے اور اس قوم کے نوجوانوں کے سامنے تعلیم کا مقصد سوائے روٹی کمانے کے اور کوئی نہ رہے۔ تاریخ کے اوراق شاہد ہیں کہ ان حضرات کے خدشات بالکل صحیح ثابت ہوئے اور سرسید کا یہ خواب کہ "فلسفہ ہمارے دائیں ہاتھ میں ہوگا، نیچرل سائنس بائیں ہاتھ میں اور لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا تاج سر پر" خواب ہی رہا، شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ علی گڑھ نے نہ تو مذہبی نقطۂ نظر سے کبھی قابلِ رشک شہرت حاصل کی اور نہ وہ عام علمی احیاء ہی کا مرکز بن سکا۔ اس ادارے کے مقاصد خواہ کتنے ہی نیک اور بلند ہوں مگر اس کی عملی افادیت صرف اسی قدر تھی کہ وہ مسلمان نوجوانوں کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں سرکاری ملازمتوں کے لیے تیار کر دے۔ اس کا نتیجہ جو ہونا تھا وہی ہوا۔ اساتذہ اور طلبہ میں مادیت اور ظاہر پرستی پیدا ہو گئی۔ سرسید کا خیال تھا کہ علی گڑھ والے اسلامی ہندوستان کی شاندار روایات کے وارث ہونگے اور اسلام پر غیر مسلموں نے جو اعتراض کیے ہیں ان کا دندان شکن جواب دیں گے۔ لیکن یہاں عالم یہ تھا کہ

در بغل تیر و کماں، کشتۂ نخچیر شدیم

نظامِ تعلیم کے متعلق کوئی بحث بھی مکمل نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس کے ساتھ زبان کا ذکر نہ کیا جائے۔ جس طرح بعض مسلمان مغربی علوم و فنون کے متعلق اس غلط فہمی میں گرفتار ہیں کہ یہ محض حقائق کی پردہ کشائی ہے اور ان سے صرف ذہنی افق ہی وسیع ہوتا ہے۔ اسی طرح زبان کے مسئلہ کو بھی یہ لوگ محض ایک ادبی مسئلہ سمجھتے ہیں۔ جس کا کوئی تعلق کم از کم کوئی خاص تعلق کسی قوم کے مذہب اور تہذیب سے نہیں ہے۔ لیکن یہ بہت بڑا دھوکا ہے جس میں کوئی شخص مبتلا ہو سکتا ہے۔ کسی قوم کی زبان اُس کے افراد کے درمیان محض اظہارِ خیال کا ذریعہ ہی نہیں ہوتی بلکہ یہ وہ زبردست قوت ہے جس سے احساسات و کیفیات کی ساری منتشر طاقتیں شخصیت کی گہرائیوں میں سموئی جاتی ہیں۔ اس سے ہمارے اندر ایک خاص ذہنی میلان پرورش پاتا ہے جو بالآخر ایک خاص طرزِ فکر اور ایک خاص قسم کی سیرت و کردار پر منتہی ہوتا ہے۔ اسی کی وساطت سے ایک قوم اپنے ماضی اور اس کی تاریخی روایات

سے وابستہ رہتی ہے۔ ان وجوہ کی بنا پر قومیت کو بنانے اور بگاڑنے میں تہذیب کو زندہ رکھنے اور فنا کر دینے میں، قومیت کا مذہب سے تعلق باقی رکھنے اور منقطع کر دینے میں زبان کا اثر غیر معمولی ہوتا ہے۔ جس قوم کے پاس اپنی زبان اور اپنا رسم الخط ہے۔ وہ ایک مستقل قوم ہے اور جو قوم اپنی زبان اور رسم الخط کو بدل دینے پر آمادہ ہو جائے اُس کے متعلق سمجھ لینا چاہیے کہ وہ اپنی موت کے وارنٹ پر دستخط کرنے کی حماقت کر رہی ہے۔ اس سلسلہ میں ہم پنڈت جواہر لال نہرو جیسے وسیع المشرب انسان کی چند تصریحات پیش کرتے ہیں۔

"ایک قوم کی زبان کا مسئلہ ہمیشہ بڑا اہم مسئلہ رہا ہے۔ آج سے تین سو برس پہلے ملٹن نے فلورنس کے ایک دوست کو خط لکھتے ہوئے اس کی اہمیت کا اظہار ان الفاظ میں کیا تھا کسی قوم کے اپنی ایک زبان رکھنے کو، خواہ وہ زبان بگڑی ہو، یا خالص ہو، ایک غیر اہم سا واقعہ نہ سمجھ لینا چاہیے اور نہ اس امر کو کہ اس کے افراد زبان کے برتنے میں صحت کا کہاں تک لحاظ رکھتے ہیں۔ کوئی تاریخی شہادت ایسی نہیں ملتی کہ کوئی سلطنت یا مملکت اس وقت تک اوسط درجے کی خوشحالی و فلاح سے محروم کر دی جا سکتی ہو جس وقت تک کہ اس کے افراد اپنی زبان کو پسند کرتے اور اس کی طرف کافی توجہ کرتے رہے ہوں۔"

ایک دوسری جگہ پنڈت جی فرماتے ہیں:۔

"رسم الخط اور ادب کا بہت گہرا تعلق ہے اور رسم الخط کی تبدیلی اس زبان کے لیے بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے جس کا ماضی شاندار رہا ہو۔ رسم الخط بدلنے کے ساتھ الفاظ کی شکلیں بدل جاتی ہیں۔ آوازیں بدل جاتی ہیں اور خیالات بدل جاتے ہیں۔ قدیم اور جدید ادب کے درمیان ایک ناقابلِ عبور دیوار حائل ہو جاتی ہے اور قدیم ادب ایک اجنبی زبان کا ادب بن کر رہ جاتا ہے جو مردہ ہو چکی ہو۔" (میری کہانی جلد اوّل ص ۲۹۵)

(باقی ص ۶۳ پر)

تفہیم القرآن

النمل

(۴)

ان سے کہو، اللہ کے سوا آسمانوں اور زمین میں کوئی غیب کا علم نہیں رکھتا۔ [۸۳] اور وہ نہیں

[۸۳] اوپر تخلیق، تدبیر اور رزاقی کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کے الٰہ واحد (یعنی اکیلے خدا اور اکیلے مستحق عبادت) ہونے پر استدلال کیا گیا تھا۔ اب خدائی کی ایک اور اہم صفت یعنی علم کے لحاظ سے بتایا جا رہا ہے کہ اس میں بھی اللہ تعالیٰ لاشریک ہے۔ آسمان و زمین میں جو بھی مخلوقات ہیں، خواہ فرشتے ہوں یا جن یا انبیاء اور اولیاء یا دوسرے انسان و غیر انسان، سب کا علم محدود ہے۔ سب سے کچھ نہ کچھ پوشیدہ ہے۔ سب کچھ جاننے والا اگر کوئی ہے تو وہ صرف اللہ ہے جس سے اس کائنات کی کوئی چیز اور کوئی بات پوشیدہ نہیں، جو ماضی و حال اور مستقبل سب کو جانتا ہے۔

غیب کے معنی مخفی، پوشیدہ اور مستور کے ہیں۔ اصطلاحاً اس سے مراد ہر وہ چیز ہے جو معلوم نہ ہو، جس تک ذرائع معلومات کی رسائی نہ ہو۔ دنیا میں بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو فرداً فرداً بعض انسانوں کے علم میں ہیں اور بعض کے علم میں نہیں ہیں۔ اور بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو بحیثیت مجموعی پوری نوع انسانی کے علم میں نہ کبھی تھیں، نہ آج ہیں، نہ آئندہ کبھی آئیں گی۔ ایسا ہی معاملہ جنوں اور فرشتوں اور دوسری مخلوقات کا ہے کہ بعض چیزیں ان میں سے کسی سے مخفی اور کسی کو معلوم ہیں، اور بے شمار چیزیں ایسی ہیں جو ان سب سے مخفی ہیں اور کسی کو بھی معلوم نہیں۔ یہ تمام اقسام کے غیب صرف ایک ذات پر روشن ہیں، اور وہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ اس کے لیے کوئی چیز غیب نہیں، سب شہادت ہی شہادت ہے۔

اس حقیقت کو بیان کرنے میں سوال کا وہ طریقہ اختیار نہیں کیا گیا جو اوپر تخلیق و تدبیر کائنات اور رزاقی

کے بیان میں اختیار کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان صفات کے آثار تو بالکل نمایاں ہیں جنہیں ہر شخص دیکھ رہا ہے، اور ان کے بارے میں کفار و مشرکین تک یہ مانتے تھے اور مانتے ہیں کہ یہ سارے کام اللہ تعالیٰ ہی کے ہیں۔ اس لیے وہاں طرزِ استدلال یہ تھا کہ جب یہ سارے کام اللہ ہی کے ہیں اور کوئی ان میں اس کا شریک نہیں ہے تو پھر خدائی میں تم نے دوسروں کو کیسے شریک بنا لیا اور عبادت کے مستحق وہ کس بنا پر ہو گئے۔ لیکن علم کی صفت اپنے کوئی محسوس آثار نہیں رکھتی جن کی طرف اشارہ کیا جا سکے۔ یہ معاملہ صرف غور و فکر ہی سے سمجھ میں آ سکتا ہے۔ اس لیے اس کو سوال کے بجائے دعوے کے انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اب یہ ہر صاحب عقل انسان کا کام ہے کہ وہ اپنی جگہ اس امر پر غور کرے کہ فی الحقیقت کیا یہ سمجھ میں آنے والی بات ہے کہ اللہ کے سوا کوئی دوسرا عالم الغیب ہو، یعنی تمام اُن احوال اور اشیاء اور حقائق کا جاننے والا ہو کائنات میں کبھی تھیں، یا اب ہیں، یا آئندہ ہوں گی؟ اور اگر کوئی دوسرا عالم الغیب نہیں ہے اور نہیں ہو سکتا تو پھر کیا یہ بات عقل میں آتی ہے کہ جو لوگ پوری طرح حقائق اور احوال سے واقف ہی نہیں ہیں ان میں سے کوئی بندوں کا فریاد رس اور حاجت روا اور مشکل کشا ہو سکے۔

الوہیت اور علم غیب کے درمیان ایک ایسا گہرا تعلق ہے کہ قدیم ترین زمانے سے انسان نے جس ہستی میں بھی خدائی کے کسی شائبے کا گمان کیا ہے اُس کے متعلق یہ خیال ضرور کیا ہے کہ اس پر سب کچھ روشن ہے اور کوئی چیز اس سے پوشیدہ نہیں ہے۔ گویا انسان کا ذہن اس حقیقت سے بالکل بدیہی طور پر آگاہ ہے کہ قسمتوں کا بنانا اور بگاڑنا، دعاؤں کا سننا، حاجتیں پوری کرنا اور ہر طالبِ امداد کی مدد کو پہنچنا صرف اُسی ہستی کا کام ہو سکتا ہے جو سب کچھ جانتی ہو اور جس سے کچھ بھی پوشیدہ نہ ہو۔ اسی بنا پر تو انسان جس کو بھی خدائی اختیارات کا حامل سمجھتا ہے اسے لازماً عالم الغیب بھی سمجھتا ہے، کیونکہ اس کی عقل بلا ریب شہادت دیتی ہے کہ علم اور اختیارات باہم لازم و ملزوم ہیں۔ اب اگر یہ حقیقت ہے کہ خالق اور مدبّر اور مجیب الدعوات اور رازق خدا کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہے جیسا کہ اوپر کی آیات میں ثابت کیا گیا ہے، تو آپ سے آپ یہ بھی حقیقت ہے کہ عالم الغیب بھی خدا کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہے۔ آخر کون اپنے ہوش و حواس میں یہ تصور کر سکتا ہے کہ کسی فرشتے یا جن یا نبی یا ولی کو، یا کسی مخلوق کو بھی یہ معلوم ہو گا کہ سمندر میں اور ہوا میں اور زمین کی تہوں میں اور سطح زمین کے اوپر کس کس قسم کے کتنے جانور کہاں کہاں ہیں؟ اور عالم بالا کے بے حد و حساب

سیاروں کی ٹھیک تعداد کیا ہے؟ اور ان میں سے ہر ایک میں کس کس طرح کی مخلوقات موجود ہیں؟ اور ان مخلوقات کا ایک ایک فرد کہاں ہے اور کیا اس کی ضروریات ہیں؟ یہ سب کچھ اللہ کو تو لازماً معلوم ہونا چاہیے، کیونکہ اس نے انہیں پیدا کیا ہے، اور اسی کو ان کے معاملات کی تدبیر اور ان کے حالات کی نگہبانی کرنی ہے، اور وہی ان کے رزق کا انتظام کرنے والا ہے۔ لیکن دوسرا کوئی اپنے محدود وجود میں یہ وسیع و محیط علم رکھ کیسے سکتا ہے اور اس کا کیا تعلق اس کارِ خلاقی و رزاقی سے ہے کہ وہ ان چیزوں کو جانے؟

پھر یہ صفت قابلِ تجزیہ بھی نہیں ہے کہ کوئی بندہ مثلاً صرف زمین کی حد تک اور زمین میں بھی صرف انسانوں کی حد تک عالم الغیب ہو۔ یہ اسی طرح قابلِ تجزیہ نہیں ہے جس طرح خدا کی خلاقی و رزاقی اور قیومی و پروردگاری قابلِ تجزیہ نہیں ہے۔ ابتدائے آفرینش سے آج تک جتنے انسان دنیا میں پیدا ہوئے ہیں اور قیامت تک پیدا ہوں گے رحمِ مادر میں استقرار کے وقت سے آخری ساعتِ حیات تک ان سب کے تمام حالات و کیفیات کو جاننا آخر کس بندے کا کام ہو سکتا ہے اور وہ کیسے اور کیوں اس کو جانے گا؟ کیا وہ اس بے حد و حساب خلقت کا خالق ہے؟ کیا اس نے ان کے باپوں کے نطفے میں ان کے جرثومے کو وجود بخشا تھا؟ کیا اس نے ان کی ماؤں کے رحم میں ان کی صورت گری کی تھی؟ کیا اس نے ان کی زندہ ولادت کا انتظام کیا تھا؟ کیا اس نے ان میں سے ایک ایک شخص کی قسمت بنائی تھی؟ کیا وہ ان کی موت اور حیات، ان کی صحت اور مرض، ان کی خوشحالی اور بدحالی اور ان کے عروج اور زوال کے فیصلے کرنے کا ذمہ دار ہے؟ اور آخر یہ کام کب سے اس کے ذمے ہوا؟ اس کی اپنی ولادت سے پہلے یا اس کے بعد؟ اور صرف انسانوں کی حد تک یہ ذمہ داریاں محدود کیسے ہو سکتی ہیں؟ یہ کام تو لازماً زمین اور آسمانوں کے عالمگیر انتظام کا ایک جز ہے۔ جو ہستی ساری کائنات کی تدبیر کر رہی ہے وہی تو انسانوں کی پیدائش و موت اور ان کے رزق کی تنگی و فراخی اور ان کی قسمتوں کے بناؤ اور بگاڑ کی ذمہ دار ہو سکتی ہے۔

اسی بنا پر یہ اسلام کا بنیادی عقیدہ ہے کہ عالم الغیب اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے اور جس قدر چاہے اپنی معلومات کا کوئی گوشہ کھول دے، اور کسی غیب یا بعض غیوب کو اس پر روشن کر دے، لیکن علمِ غیب بحیثیت مجموعی کسی کو نصیب نہیں اور عالم الغیب ہونے کی صفت صرف اللہ رب العالمین کے لیے مخصوص ہے۔ وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ

"اور اُسی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں، انہیں کوئی نہیں جانتا اُس کے سوا" (الانعام۔ رکوع ۷)۔ اِنَّ اللّٰہَ عِنْدَہٗ عِلْمُ السَّاعَةِ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْاَرْحَامِ وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا وَّمَا تَدْرِي نَفْسٌ بِاَيِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ "اللہ ہی کے پاس ہے قیامت کا علم اور وہی بارش نازل کرنے والا ہے۔ اور وہی جانتا ہے کہ ماؤں کے رحم میں کیا (پرورش پا رہا) ہے، اور کوئی متنفس نہیں جانتا کہ کل وہ کیا کمائی کرے گا اور کسی متنفس کو خبر نہیں ہے کہ کس سرزمین میں اس کو موت آئیگی" (لقمان۔ رکوع ۴) يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖ اِلَّا بِمَا شَاءَ "وہ جانتا ہے جو کچھ مخلوقات کے سامنے ہے اور جو کچھ ان سے اوجھل ہے، اور اس کے علم میں سے کسی چیز پر بھی وہ احاطہ نہیں کر سکتے الا یہ کہ وہ جس چیز کا چاہے انہیں علم دے" (البقرہ۔ رکوع ۳۴) عَالِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖ اَحَدًا اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا لِّيَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ "وہ عالم الغیب ہے، پھر وہ اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا سوائے اس رسول کے جس کو اس نے پسند کیا ہو، پھر وہ اس رسول کے آگے اور پیچھے نگرانی کرنے والے لگا دیتا ہے تاکہ یہ دیکھا جائے کہ ان رسولوں نے اپنے رب کے پیغامات پہنچا دیئے" (الجن۔ رکوع ۲) يَسْئَلُكَ النَّاسُ عَنِ السَّاعَةِ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ تَكُوْنُ قَرِيْبًا "اے نبی، لوگ تم سے قیامت کے متعلق پوچھتے ہیں۔ کہو اس کا علم تو صرف اللہ کو ہے، اور اے نبی تمہیں کیا خبر، شاید کہ قیامت قریب ہی ہو" (الاحزاب۔ رکوع ۸)۔

قرآن کی یہ تمام تصریحات زیر بحث آیت کی تائید و تشریح کرتی ہیں جن کے بعد اس امر میں کسی شک کی گنجائش نہیں رہتی کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو عالم الغیب سمجھنا اور یہ سمجھنا کہ کوئی دوسرا بھی جمیع ماکان و مایکون کا علم رکھتا ہے، قطعاً ایک غیر اسلامی عقیدہ ہے۔ شیخین، ترمذی، نسائی، امام احمد، ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے صحیح سندوں کے ساتھ حضرت عائشہؓ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ من زعم انہ رای النبی صلی اللہ علیہ وسلم یعلم ما یکون فی غد فقد اعظم علی اللہ الفریۃ واللہ یقول قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ یعنی جس نے یہ دعویٰ کیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جانتے ہیں کل کیا ہونے والا ہے اس نے اللہ پر

جانتے کہ کب وہ اٹھائے جائیں گے۔[۸۴]

بلکہ آخرت کا تو علم ہی ان لوگوں سے گم ہو گیا ہے، بلکہ یہ اس کی طرف سے شک میں ہیں، بلکہ یہ اُس سے اندھے ہیں۔[۸۵] یہ منکرین کہتے ہیں "کیا جب ہم اور ہمارے باپ دادا مٹی ہو چکے

سخت جھوٹ کا الزام لگایا، کیونکہ اللہ تو فرماتا ہے اے نبی تم کہہ دو کہ غیب کا علم اللہ کے سوا آسمانوں اور زمین کے رہنے والوں میں سے کسی کو بھی نہیں ہے"۔ ابن المنذر حضرت عبداللہ بن عباس کے مشہور شاگرد عکرمہ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا "اے محمدؐ، قیامت کب آئے گی؟ اور ہمارے علاقے میں قحط برپا ہے، بارش کب ہو گی؟ اور میری بیوی حاملہ ہے، وہ لڑکا جنے گی یا لڑکی؟ اور یہ تو مجھے معلوم ہے کہ میں نے آج کیا کمایا ہے، کل میں کیا کماؤں گا؟ اور یہ تو مجھے معلوم ہے کہ میں کہاں پیدا ہوا ہوں، مروں گا کہاں؟" ان سوالات کے جواب میں سورۂ لقمان کی وہ آیت حضورؐ نے سنائی جو اوپر ہم نے نقل کی ہے اِنَّ اللّٰہَ عِندَہٗ عِلمُ السَّاعَۃِ ․․․․ پھر بخاری و مسلم اور دوسری کتب حدیث کی وہ مشہور روایت بھی اسی کی تائید کرتی ہے جس میں ذکر ہے کہ صحابہ کے مجمع میں حضرت جبریلؑ نے انسانی شکل میں آکر حضور سے جو سوالات کیے تھے ان میں ایک یہ بھی تھا کہ قیامت کب آئے گی حضورؐ نے جواب دیا ما المسئول عنہا باعلم من السائل (جس سے پوچھا جا رہا ہے وہ خود پوچھنے والے سے زیادہ اس بارے میں کوئی علم نہیں رکھتا) پھر فرمایا یہ اُن پانچ چیزوں میں سے ہے جن کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں، اور یہی مذکورۂ بالا آیت حضورؐ نے تلاوت فرمائی۔

۸۴؎ یعنی دوسرے، جن کے متعلق یہ گمان کیا جاتا ہے کہ وہ عالم الغیب ہیں، اور اسی بنا پر جن کو تم لوگوں نے خدائی میں شریک ٹھیرا لیا ہے، ان بیچاروں کو تو خود اپنے مستقبل کی بھی خبر نہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ کب قیامت کی وہ گھڑی آئے گی جب اللہ تعالیٰ ان کو دوبارہ اٹھا کھڑا کرے گا۔

۸۵؎ الوہیت کے بارے میں ان لوگوں کی بنیادی غلطیوں پر تنبیہ کرنے کے بعد اب یہ بتایا جا رہا ہے کہ یہ لوگ جو ان شدید گمراہیوں میں پڑے ہوئے ہیں اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ غور و فکر کرنے کے بعد یہ کسی دلیل و برہان سے اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ خدائی میں درحقیقت کچھ دوسری ہستیاں اللہ تعالیٰ کی شریک ہیں۔ بلکہ اس کی اصلی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے کبھی سنجیدگی کے ساتھ غور و فکر ہی نہیں کیا ہے۔ چونکہ یہ لوگ آخرت سے بے خبر ہیں، یا اسکی

ہو نگے تو ہمیں واقعی قبروں سے نکالا جائیگا؟ یہ خبریں ہم کو بھی بہت دی گئی ہیں اور پہلے ہمارے آباو اجداد کو بھی دی جاتی رہی ہیں، مگر یہ بس افسانے ہی افسانے ہیں جو اگلے وقتوں سے سنتے چلے آرہے ہیں۔" کہو، ذرا زمین میں چل پھر کر دیکھو کہ مجرموں کا کیا انجام ہو چکا ہے۔^۸۶ اے نبی

طرف سے شک میں ہیں، یا اس سے اندھے بنے ہوئے ہیں، اس لیے فکرِ آخرت سے بے نیازی نے ان کے اندر سراسر ایک غیر ذمہ دارانہ رویّہ پیدا کر دیا ہے۔ یہ کائنات اور خود اپنی زندگی کے حقیقی مسائل کے بارے میں سرے سے کوئی سنجیدگی رکھتے ہی نہیں۔ ان کو اس کی پرواہی نہیں ہے کہ حقیقت کیا ہے اور ان کا فلسفۂ حیات اس حقیقت سے مطابقت رکھتا ہے یا نہیں۔ کیونکہ ان کے نزدیک آخرکار مشرک اور دہریے اور موحّد اور مشکک سب کو مر کر مٹی ہو جانا ہے اور کسی چیز کا بھی کوئی نتیجہ نکلنا نہیں ہے۔

آخرت کا یہ مضمون اس سے پہلے کی آیت کے اِس فقرے سے نکلا ہے کہ "وہ نہیں جانتے کہ کب وہ اٹھائے جائیں گے۔" اُس فقرے میں تو یہ بتایا گیا تھا کہ جن کو معبود بنایا جاتا ہے ــــ اور اُن میں فرشتے، جن، انبیاء، اور اولیاء سب شامل تھے ــــ ان میں سے کوئی بھی آخرت کے وقت سے واقف نہیں ہے کہ وہ کب آئے گی۔ اس کے بعد اب عام مشرکین و کفار کے بارے میں تین باتیں ارشاد ہوئی ہیں۔ اوّل یہ کہ وہ سرے سے یہی نہیں جانتے کہ آخرت کبھی ہوگی بھی یا نہیں۔ دوسرے یہ کہ ان کی یہ بے خبری اس بنا پر نہیں ہے کہ انہیں اس کی اطلاع ہی کبھی نہ دی گئی ہو، بلکہ اس بنا پر ہے کہ جو خبر انہیں دی گئی اس پر انہوں نے یقین نہیں کیا بلکہ اس کی صحت میں شک کرنے لگے۔ تیسرے یہ کہ انہوں نے کبھی غور و خوض کر کے اُن دلائل کو جانچنے کی زحمت نہیں اٹھائی جو آخرت کے وقوع کے بارے میں پیش کیے گئے، بلکہ اس کی طرف سے اندھے بن کر رہنے ہی کو ترجیح دی۔

۸۶ اس مختصر سے فقرے میں آخرت کی دو زبردست دلیلیں بھی ہیں اور نصیحت بھی۔

پہلی دلیل یہ ہے کہ دنیا کی جن قوموں نے بھی آخرت کو نظر انداز کیا ہے وہ مجرم بنے بغیر نہیں رہ سکی ہیں۔ وہ غیر ذمہ دار بن کر رہیں۔ انہوں نے ظلم و ستم ڈھائے۔ وہ فسق و فجور میں غرق ہو گئیں۔ اور اخلاق کی تباہی نے آخرکار ان کو برباد کر کے چھوڑا۔ یہ تاریخِ انسانی کا مسلسل تجربہ، جس پر زمین میں ہر طرف تباہ شدہ قوموں کے آثار

شہادت دے رہے ہیں، صاف ظاہر کرتا ہے کہ آخرت کے ماننے اور نہ ماننے کا نہایت گہرا تعلق انسانی رویے کی صحت اور عدم صحت سے ہے۔ اس کو مانا جائے تو رویہ درست رہتا ہے۔ نہ مانا جائے تو رویہ غلط ہو جاتا ہے۔ یہ اس امر کی صریح دلیل ہے کہ اس کا ماننا حقیقت کے مطابق ہے، اسی لیے اس کے ماننے سے انسانی زندگی ٹھیک ڈگر پر چلتی ہے۔ اور اس کا نہ ماننا حقیقت کے خلاف ہے، اسی وجہ سے یہ گاڑی پٹڑی سے اتر جاتی ہے۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ تاریخ کے اس طویل تجربے میں مجرم بن جانے والی قوموں کا مسلسل تباہ ہونا اس حقیقت پر صاف دلالت کر رہا ہے کہ یہ کائنات بے شعور طاقتوں کی اندھی بہری فرمانروائی نہیں ہے بلکہ یہ ایک حکیمانہ نظام ہے جس کے اندر ایک اٹل قانونِ مکافات کام کر رہا ہے، جس کی حکومت انسانی قوموں کے ساتھ سراسر اخلاقی بنیادوں پر معاملہ کر رہی ہے، جس میں کسی قوم کو بدکرداریوں کی کھلی چھوٹ نہیں دی جاتی کہ ایک دفعہ عروج پا جانے کے بعد وہ ابدالآباد تک داد عیش دیتی رہے اور ظلم و ستم کے ڈنکے بجائے چلی جائے بلکہ ایک خاص حد کو پہنچ کر ایک زبردست ہاتھ آگے بڑھتا ہے اور اس کو بام عروج سے گرا کر قعر مذلت میں پھینک دیتا ہے۔ اس حقیقت کو جو شخص سمجھ لے وہ کبھی اس امر میں شک نہیں کر سکتا کہ یہی قانونِ مکافات اس دنیوی زندگی کے بعد ایک دوسرے عالم کا تقاضا کرتا ہے جہاں افراد کا اور قوموں کا اور بحیثیت مجموعی پوری نوع انسانی کا انصاف چکایا جائے کیونکہ محض ایک ظالم قوم کے تباہ ہو جانے سے تو انصاف کے سارے تقاضے پورے نہیں ہو گئے۔ اس سے اُن مظلوموں کی تو کوئی داد رسی نہیں ہوئی جن کی لاشوں پر انہوں نے اپنی عظمت کا قصر بنایا تھا۔ اس سے ان ظالموں کو تو کوئی سزا نہیں ملی جو تباہی کے آنے سے پہلے مزے اڑا کر جا چکے تھے۔ اس سے ان بدکاروں پر بھی کوئی مواخذہ نہیں ہوا جو پشت در پشت اپنے بعد آنے والی نسلوں کے لیے گمراہیوں اور بداخلاقیوں کی میراث چھوڑتے چلے گئے تھے۔ دنیا میں عذاب بھیج کر تو صرف ان کی آخری نسل کے مزید ظلم کا سلسلہ توڑ دیا گیا۔ ابھی عدالت کا اصل کام تو ہوا ہی نہیں کہ ہر ظالم کو اس کے کیے کا بدلہ دیا جائے اور ہر مظلوم کے نقصان کی تلافی کی جائے، اور ان سب لوگوں کو انعام دیا جائے جو بدی کے اس طوفان میں راستی پر قائم اور اصلاح کے لیے کوشاں رہے اور عمر بھر اس راہ میں اذیتیں سہتے رہے۔ یہ سب لازماً کسی وقت

اِن کے حال پر رنج نہ کرو اور نہ ان کی چالوں پر دل تنگ ہو۔[۸۷] وہ کہتے ہیں کہ "یہ دھمکی کب پوری ہو گی اگر تم سچے ہو؟"[۸۸] کہو کیا عجیب کہ جس عذاب کے لیے تم جلدی مچا رہے ہو اس کا ایک حصہ تمہارے قریب ہی آ لگا ہو۔[۸۹] حقیقت یہ ہے کہ تیرا رب تو لوگوں پر بڑا فضل فرمانے

ہونا چاہیے، کیونکہ دنیا میں قانونِ مکافات کی مسلسل کارفرمائی کائنات کی فرمانروا حکومت کا یہ مزاج اور طریقہ کار صاف بتا رہی ہے کہ وہ انسانی اعمال کو ان کی اخلاقی قدر کے لحاظ سے تولتی اور ان کی جزا و سزا دیتی ہے

ان دو دلیلوں کے ساتھ اس آیت میں نصیحت کا پہلو یہ ہے کہ پچھلے مجرموں کا انجام دیکھ کر اس سے سبق لو اور انکارِ آخرت کے اسی احمقانہ عقیدے پر اصرار نہ کیے چلے جاؤ جس نے انہیں مجرم بنا کر چھوڑا تھا۔

[۸۷] یعنی تم نے سمجھانے کا حق ادا کر دیا۔ اب اگر یہ نہیں مانتے اور اپنی حماقت پر اصرار کر کے عذابِ الٰہی کے مستحق بنناہی چاہتے ہیں تو تم خواہ مخواہ ان کے حال پر کڑھ کڑھ کر اپنی جان کیوں ہلکان کرو۔ پھر یہ حقیقت و صداقت سے لڑنے اور تمہاری اصلاحی کوششوں کو نیچا دکھانے کے لیے جو گھٹیا درجے کی چالیں چل رہے ہیں اُن پر کبیدہ خاطر ہونے کی تمہیں کیا ضرورت ہے۔ تمہاری پشت پر خدا کی طاقت ہے۔ یہ تمہاری بات نہ مانیں گے تو اپنا ہی کچھ بگاڑیں گے۔ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔

[۸۸] اس سے مراد وہی دھمکی ہے جو اوپر کی آیت میں پوشیدہ ہے۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ اس فقرے میں ہماری خبر لینے کی جو در پردہ دھمکی دی جا رہی ہے یہ آخر کب عمل میں لائی جائے گی۔ ہم تو تمہاری بات رد بھی کر چکے ہیں اور تمہیں نیچا دکھانے کے لیے اپنی تدبیروں میں بھی ہم نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی ہے۔ اب کیوں ہماری خبر نہیں لی جاتی۔

[۸۹] یہ شاہانہ کلام کا انداز ہے۔ قادرِ مطلق کے کلام میں جب "شاید" اور "کیا عجب" اور "کیا بعید ہے" جیسے الفاظ آتے ہیں تو ان میں شک کا کوئی مفہوم نہیں ہوتا بلکہ ان سے شانِ بے نیازی کا اظہار ہوتا ہے۔ اس کی قدرت ایسی غالب ہے کہ اس کا کسی چیز کو چاہنا اور اس چیز کا ہو جانا، گویا ایک ہی بات ہے۔ اس کے بارے میں یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ کوئی کام کرنا چاہے اور وہ نہ ہو سکے۔ اس لیے اس کا یہ فرمانا کہ "کیا عجب ایسا ہو" یہ معنی رکھتا ہے کہ ایسا ہو کر رہے گا اگر تم سیدھے نہ ہوئے۔ ایک

فرمانے والا ہے مگر اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔[۹۰] بلاشبہ تیرا رب خوب جانتا ہے جو کچھ اُن کے سینے اپنے اندر چھپائے ہوئے ہیں اور جو کچھ وہ ظاہر کرتے ہیں۔[۹۱] آسمان و زمین کی کوئی پوشیدہ چیز ایسی نہیں ہے جو ایک واضح کتاب میں لکھی ہوئی موجود نہ ہو۔[۹۲]

یہ واقعہ ہے کہ یہ قرآن بنی اسرائیل کو اکثر اُن باتوں کی حقیقت بتاتا ہے جن میں وہ اختلاف رکھتے ہیں۔[۹۳]

معمولی تھانہ دار بھی اگر بستی کے کسی شخص سے کہہ دے کہ تمہاری شامت پکار رہی ہے تو اسے رات کو نیند نہیں آتی کجا کہ قادرِ مطلق کسی سے کہہ دے کہ تمہارا برا وقت کچھ دور نہیں ہے اور پھر وہ بے خوف رہے۔

۹۰ یعنی یہ تو اللہ رب العالمین کی عنایت ہے کہ وہ لوگوں کو قصور سرزد ہوتے ہی نہیں پکڑ لیتا بلکہ سنبھلنے کی مہلت دیتا ہے۔ مگر اکثر لوگ اس پر شکر گزار ہو کر اس مہلت کو اپنی اصلاح کے لیے استعمال نہیں کرتے بلکہ مواخذہ میں دیر ہونے کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ یہاں کوئی گرفت کرنے والا نہیں ہے اس لیے جو جی میں آئے کرتے رہو اور کسی سمجھانے والے کی بات مان کر نہ دو۔

۹۱ یعنی وہ ان کی علانیہ حرکات ہی سے واقف نہیں ہے بلکہ جو شدید بغض اور کینہ ان کے سینوں میں چھپا ہوا ہے اور جو چالیں یہ اپنے دلوں میں سوچتے ہیں، ان سے بھی وہ خوب واقف ہے۔ اس لیے جب ان کی شامت آنے کا وقت آن پہنچے گا تو کوئی چیز چھوڑی نہیں جائے گی جس پر ان کی خبر نہ لی جائے۔ یہ اندازِ بیان اسی طرح کا ہے جیسے ایک حاکم اپنے علاقے کے کسی بدمعاش سے کہے مجھے تیرے سب کرتوتوں کی خبر ہے۔ اس کا صرف یہی مطلب نہیں ہوتا کہ وہ اپنے باخبر ہونے کی اسے اطلاع دے رہا ہے، بلکہ مطلب یہ ہوتا ہے کہ تو اپنی حرکتوں سے باز آجا، ورنہ یاد رکھ کہ جب پکڑا جائے گا تو تیرے ایک ایک جرم کی پوری سزا دی جائے گی۔

۹۲ یعنی اللہ تعالیٰ کا وہ ریکارڈ جس میں ذرہ ذرہ ثبت ہے۔

۹۳ اس فقرے کا تعلق مضمونِ سابق سے بھی ہے اور مضمونِ مابعد سے بھی۔ مضمونِ سابق سے اس کا تعلق یہ ہے کہ اُسی عالم الغیب خدا کے علم کا ایک کرشمہ یہ ہے کہ ایک اُمّی کی زبان سے اس قرآن میں اُن واقعات کی حقیقت کھولی جا رہی ہے جو بنی اسرائیل کی تاریخ میں گزرے ہیں، حالانکہ خود علمائے بنی اسرائیل کے درمیان ان کی اپنی تاریخ کے اِن واقعات میں اختلاف ہے (اس کے نظائر اسی سورۂ نمل کے ابتدائی رکوعوں میں گزر چکے ہیں جیسا کہ

اور یہ ہدایت اور رحمت ہے ایمان لانے والوں کے لیے۔[۹۴] یقیناً (اسی طرح) اللہ اِن لوگوں کے درمیان[۹۵] بھی اپنے حکم سے فیصلہ کر دیگا اور وہ زبردست اور سب کچھ جاننے والا ہے۔[۹۶] پس اے نبی، اللہ پر بھروسا رکھو، یقیناً تم صریح حق پر ہو۔ تم مُردوں کو نہیں سنا سکتے[۹۷]، نہ اُن بہروں تک اپنی پکار پہنچا سکتے ہو جو پیٹھ پھیر کر بھاگے جا رہے ہوں[۹۸]، اور نہ اندھوں کو راستہ بتا کر بھٹکنے سے بچا سکتے

ہم نے اپنے حواشی میں واضح کیا ہے)۔ اور مضمونِ مابعد سے اس کا تعلق یہ ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے ان اختلافات کا فیصلہ فرمایا ہے اسی طرح وہ اُس اختلاف کا بھی فیصلہ کر دیگا جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے مخالفین کے درمیان برپا ہے۔ وہ کھول کر رکھ دیگا کہ دونوں میں سے حق پر کون ہے اور باطل پر کون۔ چنانچہ اِن آیات کے نزول پر چند ہی سال گزرے تھے کہ فیصلہ ساری دنیا کے سامنے آگیا۔ اسی عرب کی سرزمین میں اور اسی قبیلۂ قریش میں ایک متنفس بھی ایسا نہ رہا جو اس بات کا قائل نہ ہو گیا ہو کہ حق پر محمد صلی اللہ علیہ وسلم تھے نہ کہ ابوجہل اور ابولہب۔ ان لوگوں کی اپنی اولاد تک مان گئی کہ ان کے باپ غلطی پر تھے۔

۹۴ یعنی اُن لوگوں کے لیے جو اس قرآن کی دعوت قبول کریں اور وہ بات مان لیں جسے یہ پیش کرتا ہے ایسے لوگ اُن گمراہیوں سے بچ جائیں گے جن میں ان کی قوم مبتلا ہے۔ ان کو اس قرآن کی بدولت زندگی کا سیدھا راستہ مل جائے گا اور ان پر خدا کی وہ مہربانیاں ہونگی جن کا تصور بھی کفارِ قریش آج نہیں کر سکتے۔ اس رحمت کی بارش کو بھی چند ہی سال بعد دنیا نے دیکھ لیا کہ وہی لوگ جو ریگ زارِ عرب کے ایک گوشۂ گمنامی میں پڑے ہوئے تھے اور کفر کی حالت میں زیادہ سے زیادہ ایک کامیاب چھاپہ مار بن سکتے تھے، اس قرآن پر ایمان لانے کے بعد یکایک وہ دنیا کے پیشوا، قوموں کے امام، تہذیبِ انسانی کے استاد اور روئے زمین کے ایک بڑے حصے پر فرمانروا ہو گئے۔

۹۵ یعنی قریش کے کفار اور اہلِ ایمان کے درمیان۔

۹۶ یعنی نہ اس کے فیصلے کو نافذ ہونے سے کوئی طاقت روک سکتی ہے۔ اور نہ اس کے فیصلے میں غلطی کا کوئی احتمال ہے۔

۹۷ یعنی ایسے لوگوں کو جن کے ضمیر مر چکے ہیں اور جن میں ضد اور ہٹ دھرمی اور رسم پرستی نے

ہو۔ ۹۹ تم تو اپنی بات انہی لوگوں کو سنا سکتے ہو جو ہماری آیات پر ایمان لاتے ہیں اور پھر فرماں بردار بن جاتے ہیں۔

اور جب ہماری بات پوری ہونے کا وقت اُن پر آپہنچے گا ۱۰۰ تو ہم ان کے لیے ایک جانور زمین سے نکالیں گے جو ان سے کلام کرے گا کہ لوگ ہماری آیات پر یقین نہیں کرتے تھے ۱۰۱ ع اور

ع ۱

حق و باطل کا فرق سمجھنے کی کوئی صلاحیت باقی نہیں چھوڑی ہے۔

۹۸ یعنی جو تمہاری بات کے لیے صرف اپنے کان بند کر لینے پر ہی اکتفا نہیں کرتے بلکہ اُس جگہ سے کترا کر نکل جاتے ہیں جہاں انہیں اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں تمہاری بات ان کے کان میں نہ پڑ جائے۔

۹۹ یعنی ان کا ہاتھ پکڑ کر زبردستی انہیں سیدھے راستے پر کھینچ لانا اور گھسیٹ کر لے چلنا تو تمہارا کام نہیں ہے۔ تم تو صرف زبان اور اپنی مثال ہی سے بتا سکتے ہو کہ یہ سیدھا راستہ ہے اور وہ راستہ غلط ہے جس پر یہ لوگ چل رہے ہیں۔ مگر جس نے اپنی آنکھیں بند کر لی ہوں اور جو دیکھنا چاہتا ہی نہ ہو اس کی رہنمائی تم کیسے کر سکتے ہو۔

۱۰۰ یعنی قیامت قریب آجائے گی جس کا وعدہ ان سے کیا جا رہا ہے۔

۱۰۱ ابن عمرؓ کا قول ہے کہ یہ اس وقت ہوگا جب زمین میں کوئی نیکی کا حکم کرنے والا اور بدی سے روکنے والا باقی نہ رہے گا۔ ابن مردویہ نے ایک حدیث ابوسعید خدری سے نقل کی ہے جس میں وہ فرماتے ہیں کہ یہی بات انہوں نے خود حضورؐ سے سنی تھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ جب انسان امر بالمعروف اور نہی عن المنکر چھوڑ دیں گے تو قیامت قائم ہونے سے پہلے اللہ تعالیٰ ایک جانور کے ذریعہ سے آخری مرتبہ حجت قائم فرمائے گا۔ یہ بات واضح نہیں ہے کہ یہ ایک ہی جانور ہوگا یا ایک خاص قسم کی جنس حیوان ہوگی جس کے بہت سے افراد روئے زمین پر پھیل جائیں گے۔ دابۃ من الارض کے الفاظ میں دونوں معنوں کا احتمال ہے۔ بہرحال جو بات وہ کہے گا وہ یہ ہوگی کہ لوگ اللہ تعالیٰ کی اُن آیات پر یقین نہیں کرتے تھے جن میں قیامت کے آنے اور آخرت برپا ہونے کی خبریں دی گئی تھیں، تو لو اب اس کا وقت آن پہنچا ہے اور جان لو کہ اللہ کی آیات سچی تھیں۔ یہ فقرہ کہ "لوگ ہماری آیات پر یقین نہیں کرتے تھے" یا تو اس جانور کے

ذرا تصور کرو اس دن کا جب ہم ہر امت میں سے ایک فوج کی فوج ان لوگوں کی گھیر لائیں گے جو ہماری آیات کو جھٹلایا کرتے تھے، پھر ان کو (ان کی اقسام کے لحاظ سے درجہ بدرجہ) مرتب

اپنے کلام کی نقل ہے، یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے کلام کی حکایت۔ اگر یہ اسی کے الفاظ کی نقل ہے تو "ہماری" کا لفظ وہ اسی طرح استعمال کرے گا جس طرح ایک حکومت کا ہر کارندہ "ہم" کا لفظ اس معنی میں بولتا ہے کہ وہ اپنی حکومت کی طرف سے بات کر رہا ہے نہ کہ اپنی شخصی حیثیت میں۔ دوسری صورت میں بات صاف ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے کلام کو چونکہ اپنے الفاظ میں بیان فرما رہا ہے اس لیے اس نے "ہماری آیات" کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔

اس جانور کے نکلنے کا وقت کونسا ہوگا؟ اس کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد یہ ہے کہ "آفتاب مغرب سے طلوع ہوگا اور ایک روز دن دہاڑے یہ جانور نکل آئے گا۔ ان میں سے جو نشانی بھی پہلے ہو وہ بہرحال دوسری کے قریب ہی ظاہر ہوگی" (مسلم)۔ دوسری روایات جو مسلم، ابن ماجہ، ترمذی اور مسند احمد وغیرہ میں آئی ہیں، ان میں حضورؐ نے بتایا ہے کہ قیامت کے قریب زمانے میں دجال کا خروج، دابۃ الارض کا ظہور، دُخان (دھواں)، اور آفتاب کا مغرب سے طلوع وہ نشانیاں ہیں جو یکے بعد دیگرے ظاہر ہوں گی۔

اس جانور کی ماہیت، شکل و صورت، نکلنے کی جگہ، اور ایسی ہی دوسری تفصیلات کے متعلق طرح طرح کی روایات نقل کی گئی ہیں جو باہم بہت مختلف اور متضاد ہیں۔ ان چیزوں کے ذکر سے بجز ذہن کی پراگندگی کے اور کچھ حاصل نہیں ہوتا، اور ان کے جاننے کا کوئی فائدہ بھی نہیں کیونکہ جس مقصد کے لیے قرآن میں یہ ذکر کیا گیا ہے اس سے ان تفصیلات کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

رہا کسی جانور کا انسانوں سے انسانی زبان میں کلام کرنا، تو یہ اللہ کی قدرت کا ایک کرشمہ ہے۔ وہ جس چیز کو چاہے نطق کی طاقت بخش سکتا ہے۔ قیامت سے پہلے تو وہ ایک جانور ہی کو نطق بخشے گا۔ مگر جب وہ قیامت قائم ہو جائے گی تو اللہ کی عدالت میں انسان کی آنکھ اور کان اور اس کے جسم کی کھال تک بول اٹھے گی، جیسا کہ قرآن میں تصریح بیان ہوا ہے: حَتّٰٓى اِذَا مَا جَآءُوْهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ

کیا جائے گا یہاں تک کہ جب سب آجائیں گے، او(ر ان کا رب ان سے) پوچھے گا کہ تم نے میری آیات کو جھٹلایا حالانکہ تم نے ان کا علمی احاطہ نہ کیا تھا؟[۱۰۲] اگر یہ نہیں تو اور تم کیا کر رہے تھے؟[۱۰۳] اور ان کے ظلم کی وجہ سے عذاب کا وعدہ ان پر پورا ہو جائے گا، تب وہ کچھ بھی نہ بول سکیں گے۔ کیا ان کو سجھائی نہ دیتا تھا کہ ہم نے رات ان کے لیے سکون حاصل کرنے کو بنائی تھی اور دن کو روشن کیا تھا؟[۱۰۴] اسی میں بہت نشانیاں تھیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے

وَاَبْصَارُهُمْ وَجُلُوْدُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ... وَقَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا قَالُوْا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ (حم السجدہ - رکوع ۳)

[۱۰۲] یعنی تمہارے جھٹلانے کی وجہ یہ ہرگز نہیں تھی کہ کسی علمی ذریعہ سے تحقیق کرکے تمہیں معلوم ہو گیا تھا کہ یہ آیات جھوٹی ہیں۔ تم نے تحقیق اور غور و فکر کے بغیر بس یونہی ہماری آیات کو جھٹلا دیا۔

[۱۰۳] یعنی اگر ایسا نہیں ہے تو کیا تم یہ ثابت کر سکتے ہو کہ تم نے تحقیق کے بعد ان آیات کو جھوٹا ہی پایا تھا اور تمہیں واقعی یہ علم حاصل ہو گیا تھا کہ حقیقت نفس الامری وہ نہیں ہے جو ان آیات میں بیان کی گئی ہے۔

[۱۰۴] یعنی بے شمار نشانیوں میں سے یہ دو نشانیاں تو ایسی تھیں جن کا وہ سب ہر وقت مشاہدہ کر رہے تھے، جن کے فوائد سے ہر آن متمتع ہو رہے تھے، جو کسی اندھے بہرے اور گونگے تک سے چھپی ہوئی نہ تھیں۔ کیوں نہ رات کے آرام اور دن کے مواقع سے فائدہ اٹھاتے وقت انہوں نے کبھی سوچا کہ یہ ایک حکیم کا بنایا ہوا انتظام ہے جس نے ٹھیک ان کی ضروریات کے مطابق زمین اور سورج کا تعلق قائم کیا ہے۔ یہ کوئی اتفاقی حادثہ نہیں ہو سکتا، کیونکہ اس میں مقصدیت، حکمت اور منصوبہ بندی علانیہ نظر آرہی ہے جو اندھے نوائے فطرت کی صفت نہیں ہو سکتی۔ اور یہ بہت سے خداؤں کی کارفرمائی بھی نہیں ہے، کیونکہ یہ نظام لامحالہ کسی ایک ہی ایسے خالق و مالک اور مدبّر کا قائم کیا ہوا ہو سکتا ہے جو زمین، چاند، سورج اور تمام دوسرے سیاروں پر فرمانروائی کر رہا ہو۔ صرف اسی ایک چیز کو دیکھ کر وہ جان سکتے تھے کہ ہم نے اپنے رسول اور اپنی کتاب کے ذریعہ سے جو حقیقت بتائی ہے یہ رات اور دن کی گردش اس کی تصدیق کر رہی ہے۔

تھے۔[۵]

اور کیا گزرے گی اس روز جب کہ صور پھونکا جائے گا اور ہَول کھا جائیں گے وہ سب جو آسمانوں اور زمین میں ہیں[۶] — سوائے ان لوگوں کے جنہیں اللہ اس ہَول سے بچانا چاہے گا — اور سب کان دبائے اس کے حضور حاضر ہو جائیں گے۔ آج تو پہاڑوں کو دیکھتا ہے اور سمجھتا ہے کہ خوب جمے ہوئے ہیں، مگر اس وقت یہ بادلوں کی طرح اڑ رہے ہوں گے، یہ اللہ کی قدرت کا کرشمہ ہو گا جس نے ہر چیز کو حکمت کے ساتھ استوار کیا ہے۔ وہ خوب جانتا ہے کہ تم لوگ کیا کرتے ہو[۷]۔ جو شخص بھلائی لے کر آئے گا اسے اُس سے زیادہ بہتر صلہ ملے گا[۸] اور ایسے لوگ اُس دن کے ہَول سے محفوظ ہوں گے[۹]۔ اور جو برائی

---

[۵] یعنی یہ کوئی نہ سمجھ میں آسکنے والی بات بھی نہیں تھی۔ آخر انہی کے بھائی بند، انہی کے قبیلے اور برادری کے لوگ، انہی جیسے انسان ایسے موجود تھے جو یہی نشانیاں دیکھ کر مان گئے تھے کہ نبی جس خدا پرستی اور توحید کی طرف بلا رہا ہے وہ بالکل مطابقِ حقیقت ہے۔

[۶] نفخِ صور پر مفصل بحث کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، سورۂ انعام حاشیہ ۴۷۔ سورۂ طٰہٰ حاشیہ ۷۸ اور سورۂ حج، حاشیہ ۱۔

[۷] یعنی ایسے خدا سے تم یہ توقع نہ رکھو کہ اپنی دنیا میں تم کو عقل و تمیز اور تصرف کے اختیارات دے کر وہ تمہارے اعمال و افعال سے بے خبر رہے گا اور یہ نہ دیکھے گا کہ اس کی زمین میں تم ان اختیارات کو کیسے استعمال کرتے ہو۔

[۸] یعنی وہ اس لحاظ سے بھی بہتر ہو گا کہ جتنی نیکی اس نے کی ہو گی اس سے زیادہ انعام اسے دیا جائے گا۔ اور اس لحاظ سے بھی کہ اس کی نیکی تو وقتی تھی اور اس کے اثرات بھی دنیا میں ایک محدود زمانے کے لیے تھے، مگر اس کا اجر دائمی اور ابدی ہو گا۔

[۹] یعنی قیامت اور حشر و نشر کی وہ ہولناکیاں جو منکرینِ حق کے حواس باختہ کیے دے رہی ہوں گی

لیے ہوئے آئے گا، ایسے سب لوگ اوندھے منہ آگ میں پھینکے جائیں گے۔ کیا تم لوگ اس کے سوا کوئی اور جزا پا سکتے ہو کہ جیسا کرو ویسا بھرو؟

(اے محمدؐ) ان سے کہو مجھے تو یہی حکم دیا گیا ہے کہ اِس شہر کے رب کی بندگی کروں جس نے اسے حرم بنایا ہے اور جو ہر چیز کا مالک ہے؎۱۱ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں مسلم بن کر رہوں اور

ان کے درمیان یہ لوگ مطمئن ہوں گے۔ اس لیے کہ یہ سب کچھ ان کی توقعات کے مطابق ہوگا۔ وہ پہلے سے اللہ اور اس کے رسولوں کی دی ہوئی خبروں کے مطابق اچھی طرح جانتے تھے کہ قیامت قائم ہونی ہے، ایک دوسری زندگی پیش آنی ہے اور اس میں یہی سب کچھ ہونا ہے۔ اس لیے ان پر وہ بدحواسی اور گھبراہٹ طاری نہ ہوگی جو مرتے دم تک اس چیز کا انکار کرنے والوں اور اس سے غافل رہنے والوں پر طاری ہوگی۔ پھر ان کے اطمینان کی وجہ یہ بھی ہوگی کہ انھوں نے اس دن کی توقع پر اس کے لیے فکر کی تھی اور یہاں کی کامیابی کے لیے کچھ سامان کر کے دنیا سے آئے تھے۔ اس لیے اُن پر وہ گھبراہٹ طاری نہ ہوگی جو اُن لوگوں پر طاری ہوگی جنہوں نے اپنا سارا سرمایۂ حیات دنیا ہی کی کامیابیاں حاصل کرنے پر لگا دیا تھا اور کبھی نہ سوچا تھا کہ کوئی آخرت بھی ہے جس کے لیے کچھ سامان کرنا ہے۔ منکرین کے برعکس یہ مومنین اب مطمئن ہوں گے کہ جس دن کے لیے ہم نے ناجائز فائدوں اور لذتوں کو چھوڑا تھا، اور صعوبتیں اور مشقتیں برداشت کی تھیں، وہ دن آگیا ہے اور اب یہاں ہماری محنتوں کا اجر ضائع ہونے والا نہیں ہے۔

؎۱۱ یہ سورۃ چونکہ اس زمانے میں نازل ہوئی تھی جبکہ اسلام کی دعوت ابھی صرف مکہ معظمہ تک محدود تھی اور مخاطب صرف اس شہر کے لوگ تھے، اس لیے فرمایا "مجھے اس شہر کے رب کی بندگی کا حکم دیا گیا ہے"۔ اس کے ساتھ اس رب کی خصوصیت یہ بیان کی گئی کہ اس نے اسے حرم بنایا ہے۔ اس سے کفارِ مکہ کو متنبہ کرنا مقصود ہے کہ جس خدا کا تم پر یہ احسانِ عظیم ہے کہ اس نے عرب کی انتہائی بدامنی اور فساد و خونریزی سے لبریز سرزمین میں تمہارے اس شہر کو امن کا گہوارہ بنا رکھا ہے، اور جس

یہ قرآن پڑھ کر سناؤں۔ اب جو ہدایت اختیار کرے گا وہ اپنے ہی بھلے کے لیے ہدایت اختیار
کرے گا۔ اور جو گمراہ ہو اُس سے کہہ دو کہ میں تو بس خبردار کر دینے والا ہوں۔ ان سے کہو،
تعریف اللہ ہی کے لیے ہے، عنقریب وہ تمہیں اپنی نشانیاں دکھا دے گا اور تم انہیں پہچان
لوگے، اور تیرا رب بے خبر نہیں ہے اُن اعمال سے جو تم لوگ کرتے ہو ؏ ع

کے فضل سے تمہارا یہ شہر پورے ملک عرب کا مرکز عقیدت بنا ہوا ہے، تم اس کی ناشکری کرنا چاہو تو
کرتے رہو، مگر مجھے تو یہی حکم دیا گیا ہے کہ میں اس کا شکر گزار بندہ بنوں اور اسی کے آگے سر نیاز جھکاؤں
تم جنہیں معبود بنائے بیٹھے ہو ان میں سے کسی کی یہ طاقت نہ تھی کہ اس شہر کو حرم بنا دیتا اور عرب کے
جنگجو اور غارت گر قبیلوں سے اس کا احترام کرا سکتا۔ میرے لیے تو یہ ممکن نہیں ہے کہ اصل محسن کو چھوڑ کر
اُن کے آگے جھکوں جن کا کوئی ذرہ برابر بھی احسان مجھ پر نہیں ہے۔

محسنِ انسانیت ﷺ

(مخالفت کے طوفانوں سے گزرتے ہوئے)

اور اجالا پھیلتا ہی گیا

—— جناب نعیم صدیقی صاحب ——

(سلسلۂ گذشتہ)

مسلم کردار کی اخلاقی قوت کوئی دعوت بھی اگر صرف لفظی دعوت ہو اور اس کے ساتھ اخلاقی زور نہ ہو تو وہ کیسی زریں ہی کیوں نہ ہو اور تھوڑی دیر کے لئے دلوں پر کتنا ہی سحر کیوں نہ طاری کرے آخرکار دھوئیں کے مرغولوں کی طرح فضا میں تحلیل ہو جاتی ہے۔ تاریخ پر الفاظ سے کبھی کوئی اثر نہیں ڈالا جاسکتا اور اکیلی زبان کبھی انقلاب نہیں اٹھا سکتی۔ الفاظ جبھی موثر ہوتے ہیں جبکہ عمل کی لغت کے رو سے ان کے کچھ معنی ہوں۔ زبان کا جادو صابن کے سے خوشنما جھاگ اور رنگین بلبلے پیدا کر سکتا ہے مگر یہ بلبلے کسی ایک ذرۂ خاک کو بھی اس کی جگہ سے ہلا نہیں سکتے اور ساتھ کے ساتھ مٹتے چلے جاتے ہیں۔ دلیل جب کردار کے بغیر آئے، اپیل جب اخلاص سے خالی ہو۔ اور تنقید جب اخلاقی لحاظ سے کھوکھلی ہو تو انسانیت اس سے متاثر نہیں ہوا کرتی۔ کردار کی اخلاقی طاقت ہی کسی دعوت میں اثر بھرتی ہے۔ عمل کی شہادت کے بغیر زبان کی شہادت بے کار ثابت ہوتی ہے۔ حق یہ ہے کہ کَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ۔

اسلامی تحریک کی دعوت نری منطقی دعوت نہ تھی اور وہ اکیڈمک طرز کی نظریاتی بحثیں لے کے نہیں آئی تھی —— وہ سراسر ایک پیغامِ عمل تھی اور ایک تحریکِ اقدام! وہ ایک خاص طرز

کا انسان بنانے آئی تھی۔ اور وہ انسان اس نے اوّل روز سے بنانا شروع کر دیا۔ اسی انسان کا طرزِ فکر، اسی کے اخلاقی اوصاف اور اس کا من موہنا کردار تھا جو اس کے دلائل کو حقیقی وزن، اس کی اپیلوں کو سچی جاذبیت اور اس کی تنقیدوں کو گہرا اثر دینے والا تھا۔ تحریک اسلامی کا انسان خود ایک محکم دلیل تھا، خود سب سے بڑھ کر موثر اپیل تھا اور اس کا پورا وجود پرانے نظام حیوانی ساخت کے انسان، فاسد جاہلی ماحول، جامد سماج اور اس کی نااہل قیادت پر ایک بھرپور تنقید تھا۔ جاہلیت کے پاس اس زندہ دلیل، اس زندہ اپیل اور اس زندہ تنقید کا کوئی جواب نہ تھا، اس کا کوئی توڑ نہ تھا، وہ اس کے مقابلے میں بالکل بے بس تھی۔ وہ نیا انسان کہ جس کا انتہائی معیاری نمونہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلّم کی ذات میں دنیا کے سامنے تھا اور جس کے بیشمار پیکر اپنی اپنی سیرتوں کے چراغ اس قمرِ منیر کی شعاعوں سے روشن کر رہے تھے۔ وہ ایک ایسی قطعی اور ٹھوس حقیقت تھا کہ اس سے آنکھیں بند کرنا بھی اس کی نورانیت پر ایک شہادت تھا۔ اس کا انکار کرنے، اسے ٹھکرانے اور اس سے ٹکرانے والے بھی اپنے رویے سے اس کی عظمت کا اعلان کر رہے تھے۔ مکّہ میں اس انسان نے اپنی انفرادیت کی شان دکھائی تھی اور مدینہ میں آکر اس نے اپنی اجتماعیت کا جلوہ دکھایا

تحریک اسلامی اور محمد صلی اللہ علیہ وسلّم نے اس نئے انسان کی تعمیر کے اصل کام سے کبھی غفلت نہیں برتی، دوسروں کی اصلاح کرنے کے جذبے میں اسے کبھی فراموش نہیں کیا اور دوسروں پر تنقید کرنے میں گم ہو کر اس کی کمزوریوں پر گرفت کرنے اور اس کی اصلاح کرنے میں کبھی تساہل سے کام نہیں لیا۔ وہاں دوسروں کی اصلاح سے مقدم اپنی اصلاح تھی، دوسروں پر تنقید کرنے سے زیادہ اہم اپنے اوپر تنقید کرنا تھا۔ باہر تبدیلی رونما کرنے سے پہلے اپنے اندر مطلوبہ تغیرات لانا ضروری تھا۔

ایک ایسے معاشرہ کے درمیان جس کی نگاہوں میں کمانے اور کھانے پینے سے زیادہ اونچا کوئی مقصد نہ تھا، جس کی ہر مجلس ایک میکدہ اور ایک قمار خانہ اور رقص گاہ تھی جہاں سجائی جاتی

کا استعمال دنگے فساد، قتل، انتقام در انتقام اور لوٹ مار کے علاوہ کچھ نہ تھا اور جہاں تمدن ایک ایسے جنگل میں بدل گیا تھا جس کے کچھاروں میں انسانی درندے دھاڑتے رہتے تھے اور شریف اور مسکین لوگ ان کے لئے ستا شکار بنے ہوئے تھے ــــــــ وہاں محمد صلی اللہ علیہ وسلم جب انسانیت کے ایک صالح قافلہ کو جلو میں لئے ہوئے نمودار ہوئے تو اس کا وجود اوّل روز سے ماحول میں انتہائی نمایاں تھا۔ لوگ انسانیت کے اس نئے نمونے کو اچنبھے سے دیکھتے اور اسے ہر پہلو سے مختلف اور ممتاز پاتے۔ پھر اس کی نشوونما ان کی آنکھوں کے سامنے ہوئی اور اس کے تعلیم و تزکیہ کا سارا کام از اوّل تا آخر عوام الناس نے خوب اچھی طرح دیکھا۔

خواص اور عوام ہر صبح اور شام دیکھتے تھے کہ کلمۂ اسلام یکے بعد دیگرے اچھے اچھے افراد کو کھینچتا چلا جاتا ہے، یکایک دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر لوگ اٹھتے ہیں اور اپنے آپ کو اس انقلابی تحریک کے سپرد کر دیتے ہیں، وہی جو پہلے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف دانتوں اور ناخنوں تک کا زور صرف کر کے لڑ رہے ہوتے ہیں اچانک وہی سرافگندہ ہو جاتے ہیں جیسے کسی نے ان پر جادو کر دیا ہو۔ پھر جو کوئی بھی کلمۂ حق کو قبول کرتا ہے آناً فاناً اس کے ذہن و کردار میں خوشگوار تبدیلیاں آنے لگتی ہیں۔ اس کی دوستیاں اور دشمنیاں بدل جاتی ہیں، اس کی پہلی دلچسپیاں ختم ہو جاتی ہیں اور نئی دلچسپیاں پیدا ہو جاتی ہیں، پھر وہ معاً انتہائی فعّال اور سرگرم شخصیت سے آراستہ ہو جاتا ہے، اس میں ایک نئی طاقت ابھر آتی ہے، اسکی سوئی ہوئی صلاحیتیں جاگ اٹھتی ہیں، اس کے ضمیر کا چراغ پوری لَو دینے لگتا ہے، اس کا احساس انگڑائی لیتا ہے، اس کے تخیل کو نئے بال و پر مل جاتے ہیں، اس کے سینے میں حسنِ خلق کی کلیاں ایک ایک کر کے چٹکنے لگتی ہیں، اور ان کی نگہت فضا میں پھیلتی ہے۔ جو شخص کافر سے مسلم بنتا تھا اس کے اندر سے گویا ایک دوسرا آدمی نمودار ہو جاتا، وہ خود بھی محسوس کرتا کہ میں اپنے ماحول سے کچھ مختلف اور بالکل نئی چیز ہوں اور ماحول بھی دیکھتا کہ وہ اب ویسا نہیں رہا جیسا پہلے ہوا کرتا تھا۔ ــــــــــــــــ قاتل آتے اور انسانی جان کے

محافظ بن جاتے، چور آتے اور امین بن جاتے، زانی آتے اور عفت و حیا کے پیکر بن جاتے لڑاکے آتے اور صلح و آشتی کے معلم بن جاتے، کج خلق آتے اور حلیم اور متواضع بن جاتے، سود خوار آتے اور انفاق کرنے والے بن جاتے، کُند ذہن آتے اور ان کے اندر سے اعلیٰ قابلیتوں کے سوتے اُبل پڑتے، ادنیٰ سماجی مرتبوں سے اٹھتے اور شرف کی بلندیوں کو چھو لیتے، جیسے یہ کسی اور ہی دنیا کی مخلوق بن گئے ہوں، جیسے یہ مٹی کے پُتلے نہ ہوں بلکہ کسی دوسرے جوہر سے انہوں نے وجود پایا ہو۔

یہ خدا کے پرستار، رسولؐ کے دیوانے، شمعِ صداقت کے پروانے، نیکی کے نقیب، بھلائی کے داعی، بدی کے دشمن، ظلم کے مخالف ـــــــ یہ رکوع و سجود میں قرار پانے والے، یہ قرآن پڑھتے ہوئے گریۂ بے تاب میں کھو جانے والے، یہ دنوں کو مقصد کے لئے دوڑ دھوپ کرنے اور راتوں کو اللہ سے لو لگانے والے، مسکینوں کو کھانا کھلانے والے، مسافروں کی خبر گیری کرنے والے، یتیموں اور بیواؤں کے سروں پر شفقت کا ہاتھ رکھنے والے، لہو و لعب سے بے تعلق، تعیشات سے مجتنب، فضول بحثوں سے کنارہ کش، سنجیدگی و وقار کے پیکر، شائستگی و سلیقہ کے مجسّمے ـــــــ اور یہ محفلِ ہستی میں اجنبی بن جانے والے لوگ، یہ اپنی ہی بستیوں میں رہ کر غریب الوطن! ـــــــ آخر کیسے ممکن تھا کہ سارے عرب کی نگاہیں ان پر مرتکز نہ ہو جاتیں۔

یہ علمبردارانِ اسلام، جو بغیر کسی لوث کے ایک مشن کی خدمت میں ہمہ تن محو تھے، کسی معاوضے کے بغیر تحریک کے ہمہ وقتی کارکن تھے، دنیا کی بھلائی کے لئے اپنے مفاد کو بالکل بالائے طاق ڈالے ہوئے تھے۔ یہ اپنے مقدّس نصب العین کے لئے دماغوں کی کاوشیں، جسموں کی طاقتیں، جیبوں کے مال اور وقت آنے پر اپنی اور اپنے بچوّں کی جانیں تک صرف کرنے والے لوگ تھے۔ نہ ان کو معاش کی فکر تھی، نہ تن بدن کا ہوش تھا نہ راتوں کی نیند کا خیال، نہ بیوی بچوّں میں مگن رہنے کی مہلت، نہ کھیل تماشوں سے دل

بہلانے کی فرصت بلکہ ان کا پیشہ تھا تو وہی، مشغلہ تھا تو وہی، تفریح تھی تو وہی اور ذریعۂ آرام و سکون تھا تو وہی کہ سچائی کا بول بالا ہو۔ انہوں نے ہنستے مسکراتے مخالفوں کی گالیاں سُنیں، بہادرانہ شان سے جبر کے وار سہے، خوشی خوشی فاقے کاٹے، روحانی مسّرت کے ساتھ وطن چھوڑے۔ صبر کے موقع پہ انتہا درجہ کا صبر دکھایا اور مقابلہ کرنے کا وقت آیا تو مضبوط ہاتھوں سے مقابلہ کیا۔ احد احد کہتے تپتی ریت پہ لوٹ گئے، وجد آفریں شعر پڑھتے پڑھتے سولیوں پر لٹک گئے۔ گھائل ہو کر گرے تو مائل پرواز روح جھوم کر پکار اٹھی:۔ "فُزْتُ بِرَبِّ الْکَعْبَۃِ رب کعبہ کی قسم! میں تو مراد پا گیا! —— یہ کردار ہو اور پھر بھی دنیا سرنگوں نہ ہو جائے!

اس مسلم کردار نے ہر موقع پہ ایسی زریں مثالیں قائم کیں کہ زندگی کی پیشانی ان کے نور سے یومِ آخر تک جگمگاتی رہے گی۔ اس کردار کے مربیؐ نے مقتل سے روانہ ہوتے ہوئے اپنے قاتلوں کی امانتوں کی واپسی کا اہتمام کیا، اس کردار نے میدان احد میں ھندہ کے سر پہ تلوار رکھ کر اٹھالی کہ اسے ایک عورت پر تیغ آزمائی کرنا گوارا نہ ہوا، اس کردار نے زنا کا جرم سرزد ہو جانے پر بطور خود پیش ہو کر اقرار جرم کیا اور اسلامی عدالت سے باصرار انتہائی سنگین سزائے موت اپنے لئے قبول کی تاکہ خدا کے حضور میں پاک ہو کر پیش ہو سکے، اس کردار کو قبول اسلام کے چند ہی منٹ بعد جب ایک پیکرِ حسن نے دعوتِ عیش دی تو اس نے یہ کہہ کر ٹھکرا دیا کہ اب میں خدا و رسول کی نافرمانی نہیں کر سکتا، ایک جنگی سفر میں قبیلہ اُزد سے فوج کا گذر ہوا تو ایک مسلمان سپاہی نے ضرورتاً وہاں سے ایک لوٹا لے لیا لیکن یہ اس مسلم کردار کی شان تھی کہ باز پرس کی اور فوراً وہ لوٹا واپس کر دیا ایسی صدہا مثالیں، نت نئی مثالیں جس انسانی ماحول میں نمودار ہوتی ہونگی۔ اس پہ تو ہر روز زلزلہ طاری ہوتا ہوگا۔

کیا دنیا ان کا ایثار دیکھ کر مبہوت نہ ہوتی ہوگی کہ انصار نے اپنے گھر بار اور

مال ومنال آدھوں آدھ بانٹ کر مہاجرین کے سامنے رکھ دیئے ؟ کیا عوام کے دل اس مساوات کا سماں دیکھ کر کھنچتے نہ ہونگے کہ ادنیٰ ترین غلام خاندانی ہستیوں کے ساتھ اور غریب طبقوں کے افراد اہلِ ثروت کے ساتھ اور گھروں سے اُجڑ کر آنے والے لوگ مدینہ کے مقامی باشندوں کے ساتھ صف واحد میں کھڑے ہیں۔ ہر ایک کو اہمیت حاصل ہے، ہر ایک کی عزت ہوتی ہے، ہر ایک کی رائے وزن رکھتی ہے، ہر ایک کو ذمہ داریاں اٹھانے اور جوہر دکھانے کا موقع ملتا ہے۔ یہ ایک برادری ہے جس کے سارے افراد اچھے حالات میں بھی شریک رہتے ہیں اور تکلیف اور مصیبت میں بھی حصہ دار بنتے ہیں۔ بھوک کا دور ہے تو اس میں سے سب سے بڑا حصہ دار سوسائٹی کا قائد ہے اور خوشحالی کا دور آتا ہے تو اس میں سے سب سے کم حصہ وہ اپنے لئے لیتا ہے۔ ان کے غم مشترک، ان کی مسرتیں مشترک! ان کا سوچنا مشترک اور ان کے اقدام مشترک!

جاہلی تصورات کے مطابق اونچے اور نیچے خاندانوں کے درمیان شادی بیاہ کے تعلقات لوگوں کو حیرت میں ڈال دیتے ہونگے۔ رسم ورواج کی بوجھل بیڑیاں کاٹ کر سادہ معاشرت کا جو نہج نکالا گیا تھا اس کی طرف طبائع از خود کھنچتی ہونگی۔ کتنی محبت بھری زندگی تھی، کتنی ہلکی پھلکی، کتنی پرامن اور کتنی اطمینان بخش!۔۔۔۔ صحیح معنوں میں "حیاتِ طیبہ"!

پھر ماحول دیکھتا ہوگا کہ کیسی کیسی قابلیتیں ان لوگوں میں اُبھر رہی ہیں۔ سچائی کے کلمے کی گھٹا جب کبھی کسی مقام پر برس جاتی ہے تو دلوں اور دماغوں کی سرزمین سے ایسی روئیدگی ہوتی ہے کہ بنجر فضاؤں میں گل ولالہ کے تختے آراستہ ہو جاتے ہیں۔ سارا عرب اس جماعت کو دیکھ رہا ہوگا کہ جس میں بعض لوگ علوم میں ترقی کر رہے ہیں، بعض لوگ قانون میں ماہرانہ مقام حاصل کر رہے ہیں، بعض لوگ اچھے زراعت کار اور تاجر بن رہے ہیں، بعض لوگ اعلیٰ درجہ کے کمانڈر ثابت ہو رہے ہیں، بعض انتظامی مناصب کی ذمہ داریاں اٹھانے کے اہل بن رہے ہیں، کچھ سفارت کے فرائض

انجام دیتے دکھائی دیتے ہیں۔ غرضیکہ ہر آدمی کے اندر سے ایک نئی شخصیت رونما ہو کر برگ و بار لا رہی ہے۔

اس کردار کی تصویریں قرآن نے کھینچ کھینچ کر بار بار مخالفین کو بھی اور عوام کو بھی یہ احساس دلایا کہ دیکھو انسانیت کا یہ نمونہ جو نظریۂ حق کے نور سے بنتا ہے کتنا افضل ہے۔ اور امن و سلامتی کا حصول اگر ممکن ہے تو اسی کے ذریعے ممکن ہے۔ اس کردار کو تحریک اسلامی نے اپنی دعوت کی سچائی پہ دلیل بنا کر سامنے رکھا۔ پھر بار بار اس کردار کا تقابل جاہلی کردار سے بھی کیا، اہلِ کتاب کے کردار سے بھی کیا اور منافقین کے کردار سے بھی کیا۔ دونوں کو آمنے سامنے رکھکر دکھایا کہ دیکھو اور خود رائے قائم کرو۔ میدانِ واقعہ میں تو یہ تقابل از خود ہو ہی رہا تھا ۔۔۔ اور زندگی کے ہر دائرے میں ہر ہر پہلو سے ہو رہا تھا۔

کشمکش کی حالت بہ یک وقت دو بڑے اثرات رکھتی ہے۔ کشمکش میں پڑ کر کردار بنتے بھی ہیں اور کشمکش میں پڑ کر ہی کردار تباہ بھی ہوتے ہیں۔ تحریک اسلامی نے پورا پورا اہتمام کیا کہ مسلم کردار کشمکش میں پڑ کر اور نکھرے، اور سنورے، اور اچھی طرح پروان چڑھے۔ چنانچہ تلقین اور تربیت اور تزکیہ کے کڑے اہتمام کی وجہ سے مسلم کردار ترقی کرتا چلا گیا اور دوسری طرف جاہلی کردار کشمکش میں پڑ کر مسلسل پستی کی طرف لڑھکتا گیا اور آخر کار بالکل غارت ہو گیا۔ مسلم کردار کو بار بار صبر کا درس دیا گیا، اس میں برداشت کی قوت اور اپنے موقف پر جمے رہنے کی صلاحیت پیدا کی گئی۔ کبھی تاکید کی گئی کہ اشتعال میں نہ آؤ، کبھی نصیحت کی گئی کہ فرزندانِ جہالت سے نہ الجھو۔ کبھی ہمت بندھائی گئی کہ ڈھیلے نہ پڑو، مایوسی کا شکار نہ ہو، کبھی سکھایا گیا کہ برائی کا جواب بھلائی سے دو اور زیادتیوں پر عفو و درگزر سے کام لو کبھی تعلیم دی گئی کہ کسی گروہ کی دشمنی کے جذبے میں آ کر انصاف کی راہ سے نہ ہٹو کبھی ہدایت دی گئی کہ دنیا پرستوں سے اصلاح کی امیدیں نہ لگاؤ اور ان کے پیچھے پڑ کر اپنا وقت ضائع نہ کرو، کبھی ارشاد ہوا کہ مخالفین کی صف میں اہلِ جاہ و حشمت کو دیکھ کر ان کے ٹھاٹھ باٹھ سے ذرا بھی مرعوب نہ ہو اور کبھی سبق

دیا گیا کہ نتائج تک پہنچنے کے لیے عاجلانہ ذہن سے کام نہ لو۔ اس کے ہر نفسیاتی آتار چڑھاؤ پر نگاہ رکھی گئی اور ساتھ کے ساتھ اس کو فلاح کی راہ سجھائی جاتی رہی۔ خود سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی جماعت کے ایک ایک فرد پر پوری طرح توجہ رکھی اور بہترین مواقع پر کبھی نصیحت سے کبھی گرفت سے، کبھی زجر و توبیخ سے، کبھی ناراضی سے، کبھی اظہارِ خوشنودی سے کام لے کر مسلم کردار کو نشوونما دی۔ جس میں جیسی صلاحیتیں دیکھیں اور مزاج کی جیسی ساخت پائی اس کو اسی کی ضروریات کے مطابق مشورے دیئے اور جس میں جس نوعیت کی کمزوری دیکھی اس کے سامنے دینِ حق کا ویسا ہی اخلاقی تقاضا بیان کیا۔ پھر اجتماعی عمل و اقدام کے دائرے میں مسلم جماعت نے جو کچھ طرزِ عمل دکھایا اس پر ہر اہم واقعہ کے بعد کڑی تنقید کی۔ بدر و احد کے معرکے ہوں یا صلح حدیبیہ کا معاملہ، تحویلِ قبلہ ہو یا واقعۂ افک، ہر اہم تاریخی واقعے کے بعد ایک طرف مخالفین کا طرزِ عمل عوام کے سامنے رکھ دیا اور دوسری طرف اپنی جماعت کا بے لاگ محاسبہ کر کے ساری کمزوریاں برسرِعام واضح کیں اور ان کے انسداد کے لیے تدابیر بتائیں۔ دشمن کے حق میں اگر اپنے رفقاء کوئی غلط اقدام کر بیٹھے تو اس پر پردہ ڈالنے اور اسے صحیح ثابت کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ دشمن کے سامنے غلطی کا اعتراف کیا۔ کوئی جان سہواً لی گئی تو اس کا خون بہا ادا کیا۔ واقعۂ نخلہ کے سلسلے میں اپنے رفقاء پر گرفت کی۔ حضرت خالدؓ نے کلمہ پکارنے والوں کو غیر مخلص سمجھ کر سہواً قتل کر دیا تو ان کے اس فعل سے برأت اور بیزاری کا اظہار کیا۔ صورتِ واقعہ یہ نہ تھی کہ مسلم کردار (باستثنائے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم معصوم عن الخطا تھا اور کسی سے کوئی سہو یا لغزش نہ ہوتی تھی، نہ اسے اس حیثیت سے پیش ہی کیا گیا تھا۔ بلکہ وہ اپنی مجموعی ساخت کے اعتبار سے پاکیزہ تھا اور اس میں قبولِ اصلاح کی استعداد اور نشوونما و ترقی کی صلاحیت تھی۔ وہ بہ حیثیت ایک کُل کے جاہلی کردار سے بیّن طور پر فائق و افضل تھا اور برابر پیشقدمی کر رہا تھا۔

کسی بھی جماعتی قیادت اور بنے بنائے ماحول کا مقابلہ کرنا کوئی کھیل نہیں ہوتا۔ یہ کام بڑے کام ہوتے ہیں، ان میں بڑی مار کھانی پڑتی ہے اور بڑے ٹھنڈے جوش سے ان معرکوں کو سر کیا

جا سکتا ہے۔ ماحول کی قوت آگے بڑھنے والوں کو کمر سے پکڑ پکڑ کے برابر کھینچتی رہتی ہے، اصلاح کرنے والوں کو از سر نو بگاڑ دینا چاہتی ہے، ان کے دلوں میں نفوذ کے لیے رخنے تلاش کر کر کے کوشاں رہتی ہے کہ اپنے سے عقیدوں، اپنی سی رسموں اور اپنی سی عادات کو کسی طرح پھر ان میں گھسا دے اور کوئی راہ ذہنی مصالحت کی نکال کر پیشقدمی کرے۔ ناسازگار حالات میں لمبی کشمکش جب قوتوں کو مضمحل کر دیتی ہے اور ہمتوں کو تھکا دیتی ہے تو بڑے بڑے مخلص لوگوں کے قدم پیچھے کھسکنے لگتے ہیں۔ آدمی کچھ انقلابی قدروں کو چھوڑ کر پرانی قدروں کو قبول کرنے پر تیار ہو جاتا ہے۔ اصول و اعتقاد میں نہ سہی، ثقافتی آداب و اطوار، رہن سہن، وضع قطع میں بیرونی اثرات قبول کرنے پر تیار ہوتا ہے۔ بس اتنا سا راستہ کھل جائے تو پھر ماحول اسے آہستہ آہستہ فراخ کرتا چلا جاتا ہے۔ اور بالآخر اپنے سارے لوازم اندر گھسا لے جاتا ہے۔ تکمیلِ کار ایک نسل کے دور میں نہ سہی، اگلی نسل کے عہد میں سہی! مگر تحریکِ اسلامی نے مسلم کردار کو تعمیر کرتے ہوئے اس خطرے کا پورا پورا لحاظ رکھا۔ اسے بہت ہی آہنی ساخت دی اور تحفظ کی پوری تدابیر اختیار کیں۔ ایک طرف تو اسے أَشِدَّاءُ عَلَى الكُفَّار یعنی مخالفوں کے مقابلے میں ایک مضبوط چٹان بنانے کے لیے رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ ہونے کا درس دیا اور دوسری طرف غیروں کی تقلید، غیروں سے مرعوبیت، غیروں سے رازدارانہ تعلقات اور بے تکلفانہ قرابت رکھنے سے بالکل روک دیا۔ یہی ذہنی استحکام جماعت میں پیدا کرنے کے لیے تو مسلمانوں کو حکم تھا کہ وہ ہجرت کر کے مدینہ آجائیں۔ اور اگر کسی جگہ معتدبہ افراد یکجا ہوتے تو ہاں ان سے بیعتِ اعرابی (یعنی ایسی بیعت جس سے ہجرت واجب نہ ہو) لی جاتی تو ان کو بھی یہ تاکید ضرور تھی کہ " فَارِقُوا الْمُشْرِكِين " یعنی اہلِ شرک سے برادری، دوستی، شادی بیاہ کے تعلقات نہ رکھو بلکہ اپنی سوسائٹی الگ اٹھاؤ۔ غیر مسلم والدین کی خدمت کی تاکید کرنے کے ساتھ ساتھ یہ کڑا حکم بھی دیا گیا کہ اسلام سے انحراف کے لیے کہیں تو " فَلَا تُطِعْهُمَا " اسلام کے خلاف کسی کی کوئی طاعت نہیں کی جا سکتی۔ اس کردار کی شان یہ تھی کہ وہ نہ ایران کی پرشکوہ تہذیب سے متاثر ہوا اور نہ روم کے ٹھاٹھ دار تمدن کے سامنے اس کا دل پسیجا۔ وہ بڑے بڑے درباروں میں اپنی بدویانہ شان کے ساتھ قالینوں کو روندتا ہوا

بغیر اپنی گردن جھکائے پہنچا اور کہنے کی بات اس طرح کہی جیسے وہ بونوں کے درمیان کھڑا بات کر رہا ہو۔ اس کردار کو جب ذہنی لحاظ سے اتنا مستحکم بنا دیا گیا اور ہر قسم کے احساسِ کہتری سے اسے بالاتر کر دیا گیا تو پھر اسے حریفوں نے میدانِ جنگ میں بھی پکارا تو اس نے شجاعت و استقامت کی زندۂ جاوید نظیریں قائم کر دیں۔ دنیا نے دیکھ لیا کہ یہ کردار قلتِ تعداد اور کوتاہیٔ اسباب کے باوجود نرم چارہ نہیں ہے بلکہ اس سے آویزش تو لوہے کے چنے چبانے کے ہم معنی ہے۔

اس مسلم کردار کے بے شمار کٹر مخالفین ہونگے جو اس کا طنز و استہزاء کرتے ہوئے دل ہی دل میں محسوس کرتے ہونگے کہ یہ ہم سے ہزار درجے افضل اور برتر ہے۔ بے شمار حریف ظاہراً مخالفت کرنے کے باوجود باطن میں رشک کرتے ہونگے کہ کاش کہ ہم بھی ایسے ہوتے اور ہم بھی اس برادری میں شامل ہوتے۔ اس کردار کو گالیاں دینے والے، اس کی ہجو کرنے والے اور اس کے خلاف پروپگنڈا کرنے والے کبھی کبھی لمحۂ فکر میں پڑ کر آپسے آپ کہتے ہونگے کہ ہم جھوٹ بول رہے ہیں اور اپنے آپ کو دھوکہ دے رہے ہیں۔ چنانچہ بے شمار مواقع پر مخالفین نے زبانوں سے بھی اپنا دلی اعتراف بیان کر دیا۔ معرکۂ اُحد کے خاتمہ پر جب پہاڑی پر کھڑے ہو کر ابوسفیان نے حضرت عمرؓ سے پوچھا کہ کیا محمدؐ قتل ہو گئے ہیں؟ حضرت عمرؓ نے جواب دیا کہ "بخدا! وہ زندہ ہیں اور تمہاری بات سن رہے ہیں" تو ابوسفیان نے کہا کہ اگرچہ ابن قمیہ کہتا ہے کہ میں نے محمدؐ کو قتل کر دیا مگر ہم تم کو اس سے زیادہ سچا سمجھتے ہیں۔" اسی طرح معاہدۂ حدیبیہ سے قبل عروہ بن مسعود سفیرِ قریش نے مسلم جماعت کا جو منظر دیکھا اسے جن لفظوں میں اکابرِ قریش سے بیان کیا وہ اس تاثر کے گواہ ہیں جو اغیار پر برابر پڑ رہا تھا۔ اسی طرح قیصر کے دربار میں ابوسفیان نے جو بیان اسلام کا مخالف ہونے کے باوجود حضورؐ اور آپ کی تحریک کے بارے میں دیا وہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ دشمنی کرنے والے بھی محمدؐ اور اسلام کی عظمت کا اعتراف رکھتے تھے۔ مدینہ کا تحصیلدار خیبر کے یہودیوں سے وصولی کرنے جاتا ہے تو اس کی تقسیم کی صحت دیکھ کر وہ گواہی دیتے ہیں کہ یہی عدل ہے جس پر آسمان و زمین قائم ہیں۔

آئے دن عرب کے کونے کونے میں تو خیز مسلم سوسائٹی کے انوکھے احوال کے چرچے ہوتے ہونگے۔

اس کے افراد کے تذکرے رہتے ہونگے۔ لوگوں کی نگاہیں مدینہ پر لگی رہتی ہونگی کہ وہاں کیا ہو رہا ہے؟ لوگ ایک دوسرے سے پوچھتے ہونگے کہ آج تازہ ترین نیا مدوجزر کیا واقع ہوا۔ مسافروں اور قافلوں کے ذریعے روزمرہ احوال کی اطلاعات دُور دور تک پھیلتی ہونگی اور لوگ ہر آیند و روند سے دریافت کرتے ہونگے کہ کوئی نئی بات" سناؤ"۔ گویا مدینہ کی ہر بات میں حد درجہ کی" خبریت" (NEWS VALUE) پیدا ہو گئی ہوگی۔ جہاں دو آدمی اکٹھے ہوتے ہونگے، محمدؐ اور مسلم سوسائٹی اور اسلامی تحریک اور مدینہ کی حکومت گفتگو کے اوّلین موضوع ہوتے ہونگے، عورتیں مل بیٹھتی ہونگی تو مدینہ کے بارے میں طرح طرح کی افواہوں کو نمک مرچ لگا کر بیان کرتی ہونگی، ماں باپ بچوں کو" خوش کرنے"، بہلانے اور ڈرانے کے لیے نہ جانے مدینہ کے واقعات سے کیا کیا مواد لیتے ہونگے۔ ہوا کا ہر جھونکا اس مسلم کردار کی خوشبو لیے نخلستانوں اور صحراؤں اور خیمہ گاہوں سے گذرتا ہوگا۔

اسلامی تحریک کی یہ اخلاقی قوت ہی اس کی دلیل اور اپیل کو مؤثر اور نتیجہ خیز بنانے والی تھی۔ اور یہ مسلم کردار کی عظمت کا اعتراف تھا جس نے لاکھوں دلوں کو مسخر کر لیا۔ یہاں ہم چند مثالیں بیان کریں گے کہ کس طرح اسلام کا مقناطیس ہر چہار جانب سے بکھرے ہوئے ذراتِ انسانیت کو اپنی طرف کھینچتا چلا گیا۔

پہلے مکہ کے دور کو لیجیے۔ مشہور شاعر طفیل دوسی آتا ہے اور قریش اسے حضورؐ سے ملنے سے باز رکھتے ہیں۔ آخر وہ خود جا حاضر ہوتا ہے اور قرآن کی چند آیات سُن کر محض ان کے اثر سے اسلام قبول کر لیتا ہے۔ عمرو بن عبسہ حضورؐ کا چرچا سن کے آتے ہیں اور اسلام دل میں جگہ پا لیتا ہے۔ حضورؐ کے بچپن کے ساتھی ضماد بن ثعلبہ ناصح اور چارہ گر بن کے آتے ہیں مگر زبانِ مبارک سے خدا کی حمد کے چند بول سُن کر ہی مفتوح ہو جاتے ہیں۔ ایک صحرائی قبیلہ جس کا پیشہ ڈاکہ زنی ہے اس کا ایک نوجوان ابوذرؓ اسلام کا چرچا سن کے آتا ہے اور مخالف ماحول سے بچ بچ کر حضورؐ تک پہنچتا ہے۔ دعوت سنتا ہے اور تحریکِ حق کو اپنا دل دے بیٹھتا ہے۔ اس میں یکایک ایک ایسا جذبہ اٹھتا ہے کہ وہ حرم میں جا کر کلمۂ حق کا اعلان کرتا ہے اور پھر اس جُرمِ عشق کی تعزیر کا مزہ چکھتا ہے۔

پھر جو جو شخص تحریک اسلامی کے حلقہ میں داخل ہوتا گیا وہ اپنے اپنے دائرہ اثر میں خود ایک داعی بنتا گیا۔ بعض کے اثر سے قبیلے کے قبیلے اسلام کو قبول کرنے گئے۔ سوید بن صامت حضورؐ سے ملاقات کرتا ہے اور گہرا اثر لے کے جاتا ہے۔ ایاس بن معاذ مدینہ سے آکر حضورؐ کی دعوت کا قائل ہو جاتا ہے اور پھر مدینہ میں نظامِ حق کی طلب پیدا کرتا ہے۔ نجران سے ۲۰ عیسائیوں کا وفد آکر حضورؐ سے اسلام کے پیغام کا شعور حاصل کرتا ہے۔ اور باوجودیکہ قریش ان کو ورغلاتے ہیں، یہ لوگ حق کی روشنی کو سینوں میں جذب کر کے رخصت ہوتے ہیں۔ مہاجرینِ حبشہ سے یمن کے لوگ متاثر ہو کر اسلام کو سینوں میں جگہ دیتے ہیں اور انہی کے ذریعے شاہ نجاشی کا دل ایمان سے منور ہو جاتا ہے۔

مدینہ میں اوس و خزرج کے لوگ تو حضورؐ کی آمد سے پہلے ہی تیزی سے اسلام میں آرہے تھے اور حضورؐ کے ہجرت کر کے آجانے کے بعد تو کوئی گھر خالی نہ رہا جس میں اسلام کی روشنی نہ جا پہنچی ہو۔ حیرت ناک یہ تھا کہ یہود کا ایک عالم عبداللہ بن سلام حضورؐ کے ایک سادہ سے خطاب (ایہا الناس! افشوا السلام واطعموا الطعام وصلوا الارحام وصلوا باللیل والناس نیام) کو سن کر قریب آجاتا ہے اور تھوڑے سے غور و فکر کے بعد فیصلہ کر کے سرورِ عالم کی خدمت میں شہادتِ حق ادا کرتا ہے۔ اسی طرح عیسائیوں میں سے ایک نامور راہب و عالم ابوقیس صرمہ بن ابی انس تحریک اسلامی کی پکار پر لبیک کہتا ہے۔ جبیر بن مطعم بدر کے قیدیوں کو چھڑانے آئے تھے اور حضورؐ کی زبان سے چند آیات کو توجہ سے سننے کا موقع ملا۔ حقیقت ایسی منکشف ہوئی کہ انہوں نے محسوس کیا کہ جیسے دل پرواز کر گیا ہے۔

قریش کے غلام ابورافع مکہ کی طرف سے سفیر بن کر مدینہ آئے تو سینہ اسلام کے لیے کھل گیا۔ واپس جانے پر تیار نہ تھے۔ حضورؐ نے سمجھایا کہ سفیر کو روکا نہیں جا سکتا تم واپس جاؤ اور پھر اسلام کی کشش ادھر کھینچے تو مدینہ آجاؤ۔ چنانچہ وہ مکہ گئے اور واپس آکر اسلامی جماعت میں شریک ہو گئے۔

بنو قریظہ کے خلاف ان کے جرائم کی سزا دینے کے لیے چڑھائی ہوتی ہے تو اس عالم میں ان کا ایک فرد عمرو بن سعد اسلام قبول کرتا ہے۔ ثمامہ بن اثال حنفی رئیسِ یمامہ قید ہو کر آتا ہے اور حضورؐ

کے طرزِ عمل سے متاثر ہو کر اسلامی جماعت کا ایک فرد بن جاتا ہے۔ غزوہ احد برپا ہے کہ عمرو بن ثابت اصیرم (بنی عبدالاشہل) عین اسی لمحے حق کے سامنے سرِ تسلیم خم کر کے سیدھے معرکہ کارزار میں شریک ہو جاتے ہیں اور شہادت سے فائز ہوتے ہیں۔ معرکہ خندق کے کٹھن حالات میں نعیم بن مسعود تحریکِ اسلامی کے قدموں میں آگرتے ہیں۔ ابوالعاص مدینہ آتے ہیں تو بالکل غیر متوقع طور پر اسلام کا اعلان کرتے ہیں۔ خیبر کے یہود کو جنگی تیاریاں کرتے دیکھ کر ان کا ایک چرواہا اسود معلوم کرتا ہے کہ کس سے جنگ ہے اور کیوں ہے۔ پھر جب اسے معلوم ہوتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف تیاریاں ہیں جنہوں نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے تو وہ جذبۂ بے تاب لیے حاضر ہوتا ہے اور حقیقت معلوم کرتا ہے اور پھر مفتوح ہو جاتا ہے۔ حضرت خالدؓ اور عمرو بن عاصؓ جیسے ممتاز افراد (صلح حدیبیہ اور جنگ موتہ کے درمیان) یکایک قریش سے ٹوٹ کر اسلامی ریاست کے ساتھ آملتے ہیں۔ جاہلیت کے محاذ سے لڑتے لڑتے اندر سے دل اُکتا چکے تھے، سو یکایک ان کو تحریکِ اسلامی نے کھینچ لیا۔ فضالہ فتح مکہ کے موقع پر اور شیبہ بن ابی طلحہ معرکہ حنین کے موقع پر حضورؐ کے قتل کے ارادے کر کے پہنچے، مگر خود ہی تیغِ حق سے گھائل ہو گئے۔ وفد ہوازن و بنو سعد کے آنے پر حضورؐ نے مالک بن عوف کو یاد کیا اور خواہش کی کہ وہ اسلام لائیں۔ پیغام پہنچنے پر مالک بن عوف ثقیف سے چھپ کر اگلے ہی دن حاضر ہو گئے اور اسلامی محاذ پر آگئے۔ قبیلۂ طے پر اسلامی دستہ نے فتح پائی تو حاتم کی بیٹی قیدیوں میں مدینہ لائی گئی۔ اُس نے حضورؐ سے حُسنِ سلوک کی درخواست کی جسے قبول فرما کر آپؐ نے اسے سواری کا انتظام کر کے واپس بھیج دیا۔ اس نے اپنے بھائی عدی بن حاتم کو جس کے دل میں اسلام کے خلاف غصہ کی آگ مشتعل تھی، سارا حال سنایا اور مدینہ حاضر ہونے کی تلقین کی۔ عدی آیا اور اگر بچشم خود حالات کا پورا جائزہ لیکر جب محسوس کر لیا کہ حضورؐ خدا کے سچے نبی ہیں تو حلقۂ اسلام میں داخل ہو گیا۔ کعب بن زہیر جس نے حضورؐ اور تحریکِ اسلامی کے خلاف شاعری کا محاذ کھول رکھا تھا، از خود مدینہ آیا اور عرض کیا کہ تائب ہو کر مسلمان ہوا ہوں، امان دیجیے۔ امان مل گئی۔ پھر اس نے وہ قصیدہ (بانت سعاد) پڑھا جو تاریخی حیثیت اختیار کر گیا۔ عبداللہ ذوالبجادین کو دیکھیے کہ یہ بھولا بھالا

نوجوان مدینہ سے چلنے والی نسیم کے جھونکوں سے متاثر ہو جاتا ہے مگر چچا کے ڈر سے اپنے ارمان کو سینے میں کچھ عرصہ دبائے رکھتا ہے۔ چچا سے مایوس ہو جاتا ہے تو چچا، اس کے مال و جاہ اس کے دیئے ہوئے لباس اور گھر کے ماحول کو سلام و داع کہہ کر کمبل پوش بنا ہوا مدینہ پہنچتا ہے اور زندگی اسلامی تحریک کے حوالے کر دیتا ہے۔ بحرین کے قبیلہ عبد القیس کے ایک تاجر منقذ بن حبان کاروباری سفر پر نکلے۔ مدینہ راستے میں پڑتا تھا۔ وہاں کچھ وقت کے لیے ٹھہرے۔ حضورؐ کے پیش نظر یہ نقشۂ کار تو رہتا ہی تھا کہ بیرونِ حجاز کے علاقوں سے رابطہ بڑھانے کے ذرائع پیدا ہوں اور کام کے آدمی وہاں بھی تحریک کو حاصل ہوں، اس لیے اطلاع ملتے ہی خود تشریف لے گئے۔ دعوت پیش کی اور منقذ نے قبول کی۔ گھر گئے تو بحث و تمحیص کے بعد ان کے والد بھی حلقۂ اسلامی میں آ گئے۔ بعد میں قبیلہ کے عام لوگوں نے بھی ان کی مساعی سے اسلام قبول کیا۔ متعدد لوگوں نے بادشاہتیں، سیادتیں اور عہدے چھوڑ کر اپنے آپ کو خدا کی عبودیت کے مقام پر لا کھڑا کیا۔

ان مثالوں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ دعوتِ حق کی کھیتی کس طرح اُگ رہی تھی۔ آج یہاں بیج پھوٹا، کل وہاں سے تخمِ اخلاص نے کونپل نکالی، صبح ادھر کوئی کلی چٹک گئی، شام اُدھر کسی آنکھ نے آنکھ کھولی۔ جیسے شام کو آسمان پر تارے ٹمٹماتے ہیں، پہلے ایک، پھر دو چار، پھر دس بیس، پھر سو پچاس، پھر ہزاروں لاکھوں بلکہ ان گنت۔ گویا ریت کے ذرّے خوابِ جمود سے ایک ایک کر کے چونک رہے تھے، ایک نے انگڑائی لی، دوسرے نے سر اٹھایا، تیسرے نے حرکت کا آغاز کیا، چوتھے نے آنکھ کھولی اور پھر جیسے وہ کرنوں کے پَر لگا کر اڑنے لگے، اڑ کر باہم گلے مل گئے اور ان سے ایک نئی دنیا وجود میں آ گئی۔

ہم قبولِ اسلام کی تیز رفتار عوامی رَو کا ذکر تو بعد میں کریں گے جو ایک خاص مرحلہ آنے پر چلی اور لوگ جوق در جوق خود آگے بڑھ بڑھ کر تحریک کے دھارے میں بہتے چلے گئے۔ یہاں ہم ان خواص کا ذکر کر رہے ہیں جو اپنے اپنے حلقوں میں پیش رو نکلے۔ ایسے لوگوں میں جب کوئی ایک بھی مسلم بن جاتا تو پھر وہ اپنے قبیلے اور اپنے علاقے میں خود ایک داعی و معلم بھی ہوتا،

اس کی ذات میں تحریک کا ایک مقامی مرکز کھل جاتا۔ وہ اپنے قول اور اپنے کردار سے کتنے ہی دوسرے ساتھیوں کو ـــ بسا اوقات پورے کے پورے قبیلوں کو ـــ اسلام کی بارگاہ میں لا پیش کرتا۔ علاوہ ازیں خود مدینہ کے مرکزِ دعوت کی سرگرمیاں بھی اور اس کے علاقائی کارکنوں کی کوششیں بھی بے شمار ایسے آدمی پیدا کرتی جاتیں جو اگرچہ براہِ راست اسلامی تحریک کے حلقہ میں فوراً شامل نہ ہوتے لیکن اس کے ساتھ ہمدردی اور حمایت کا رویّہ اختیار کر لیتے اور ایسے لوگوں کی ہمدردیاں اور حمایتیں بھی اپنی جگہ بڑا کام کرتیں۔ ایسے حامیانِ تحریک غیروں اور مخالفوں میں بھی بیٹھ کر بات کر سکتے تھے اور ان کی بات سننے میں کسی طرح کا تعصب حائل نہ ہوتا۔ ایسے لوگ قریشِ مکّہ کے درمیان بھی بکثرت تھے، یہودیوں میں بھی تھے اور بدوی قبائل میں بھی۔ ایسے ہی افراد تھے جنہوں نے صلح حدیبیہ کے موقع پر قریش کو معاہدہ کرنے کے لیے تیار کیا۔ ایسی ہی ایک شخصیت تھی جس نے جنگ احد کے بعد ابوسفیان کو پلٹ کر مسلمانوں پر دوبارہ حملہ کرنے سے روکا۔ ایسی ہی ایک شخصیت وہ بھی تھی جس نے حضورؐ کے زمانۂ نظر بندی میں شعب ابی طالب کو جانے والے غلّہ کو رکوانے کی مخالفت کی۔ اور ایسی ہی شخصیتیں تھیں جنہوں نے سرے سے بائیکاٹ کے اس ناپاک معاہدے کو ختم کرایا جو حضورؐ کے خاندان کے خلاف باندھا گیا تھا۔ ایسی ہی ایک شخصیت مخیرق یہودی کی بھی تھی جس نے یہودی ہوتے ہوئے اپنی جان تحریکِ اسلامی کی حمایت میں لگا دی اور دوسرے یہودیوں کو بھی احساس دلانے کی کوشش کی۔ غرضیکہ اسلام لانے والی تعداد کے ارد گرد ایک بڑا حلقہ ایسے حمایتیوں کا بھی ہر جگہ بنتا گیا اور وہ بھی تحریک کے فروغ کے ساتھ وسیع تر ہوتا گیا۔ اس عنصر کا بھی اسلام کے لیے راستے ہموار کرنے میں بہر حال حصّہ رہا ہے اور اس میں سے بیشتر لوگ بعد میں داخلِ اسلام ہونے کی سعادت سے بہرہ مند بھی ہوئے۔ غرضیکہ اسلامی انقلاب کے نقیبوں کا ایک جال سا سارے عرب میں از خود پھیلتا چلا گیا۔ مدینہ ان سب کے لیے مرکزِ تحریک تھا جس سے قوت حاصل کر کے ہر طرف پھیلے ہوئے حق پرست کلمۂ اسلام کی برقی رَو اپنے اپنے ماحول میں دوڑا رہے تھے۔ مدینہ گویا دھڑکتا ہوا دل تھا جس سے افکار و جذبات

خون کی موجوں کی طرح عرب کے کونے کونے میں پہنچ رہے تھے۔ وہ ایک سورج تھا اور اس کے گرد دُور دُور تک پھیلے ہوئے اجرام روشنی حاصل کر کر کے فضاؤں کو منور کر رہے تھے۔

یہاں ہم سرسری طور پر اس کی چند مثالیں بیان کرتے ہیں جن سے اندازہ ہوگا کہ ایک یا چند افراد نے کس طرح پورے پورے قبیلوں یا علاقوں کو متاثر کر لیا۔ ایک مثال تو خود مدینہ ہی کی ہے اور شاید سب سے بڑی اور شاندار مثال ہے۔ ایک نوجوان سوید بن صامت مکہ جا کر رسولؐ خدا سے کلمۂ اسلام کی روشنی حاصل کرتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ بہت سی تعداد متاثر ہو جاتی ہے، یہاں تک کہ مدینہ اسلامی تحریک کا مرکز بننے کے قابل ہو جاتا ہے۔ طفیل دوسی اپنے مزاج کی وجہ سے اگرچہ قبیلہ کو جلد متاثر نہ کر سکے لیکن ان کی وجہ سے یمن میں تحریکِ اسلامی کا تعارف ہو گیا اور مہاجرین حبشہ سے متاثر ہو کر قبیلۂ اشعر نے کسی خارجی تحریک کے بغیر اپنے آپ کو اسلام کے محاذ پر پیش کر دیا۔ ضماد بن ثعلبہ کی دعوت سے پورا قبیلہ ازدشنوءہ حلقۂ اسلام میں آ گیا۔ حضرت ابوذر غفاری اسلامی نظریۂ انقلاب کی روح سے سرشار ہو کر مکہ سے لوٹے تو ان کی دعوت سے ان کا آدھا قبیلہ نظامِ حق کا علمبردار بن گیا اور بقیہ آدھا حضور کے مدینہ جانے پر مسلمان ہوا۔ پھر اسی قبیلہ غفار کے اثر سے قبیلۂ اسلم میں بھی اسلام نے نفوذ کیا اور آہستہ آہستہ یہ پورا قبیلہ بھی جاہلیت سے کٹ کر اسلامی انقلاب کا علمبردار بن گیا۔ منقذ بن حیان مدینہ سے صداقت کا نور جذب کر کے اپنے وطن بحرین پہنچے تو دعوتِ حق کا کام شروع کر دیا اور لوگ متاثر ہونے لگے۔ چنانچہ کچھ عرصہ بعد یہ ہم مسلک رفیقوں کا وفد لے کر مدینہ حاضر ہوئے۔ غرضیکہ بات وہی انجیل کی سامنے آتی ہے کہ خدائی بادشاہت (دعوتِ حق) کی مثال خمیر کی سی ہے کہ ایک عورت نے ذرا سا خمیر آٹے میں ملایا اور وہ سارے کا سارا خمیر ہو گیا۔

جہاں کہیں اسلام پہنچتا اور مناسب تعداد متاثر ہو جاتی، وہاں لازماً مسجد کی بنا ڈالی جاتی۔ مسجد صرف ایک عبادت گاہ ہی کی حیثیت نہ رکھتی تھی بلکہ وہ اسلام کا تمدنی مرکز ہوتی تھی اور بیک وقت تعلیم گاہ، دارالمشورہ، سماجی اجتماع گاہ اور مہمان خانہ کا کام بھی دیتی تھی۔ مسجد در حقیقت

اسلامی تحریک کی ایک مرئی علامت (SYMBLE) ہوتی تھی اور علاقہ بھر میں مسجد کا وجود اس امر کا اعلان ہوتا تھا کہ یہاں اسلام پہنچ چکا ہے۔ اسی لیے حضورؐ ایک طرف نو مسلم قبائل کو ہدایت دیتے تھے کہ وہ مسجدیں بنائیں اور دوسری طرف فوج کو حکم تھا کہ جہاں کہیں مسجد دکھائی دے اور جس بستی سے اذان کی پکار گونجے وہاں تلوار کبھی حرکت میں نہ لائی جائے۔ یہ گویا مزید ترغیب تھی تعمیر مساجد کی۔ لوگ اپنے نئے انقلابی مسلک کا اعلان و اظہار کرنے کی ایک مناسب شکل یہی پاتے تھے کہ بستی میں مسجد بنائیں اس سے اذان کے پیرائے میں تحریک اسلامی کے عقیدوں کا اعلان کریں اور اس میں نظام نماز قائم کر کے اجتماعیت سے بہرہ مند ہوں۔ حضورؐ کی ترغیب کا نتیجہ تھا کہ خود مدینہ میں آپؐ کے حین حیات میں نو مسجدیں تعمیر ہو گئی تھیں۔ ایک مسجد اوائل ہی میں بحرین میں بھی موجود تھی۔ اور مسجد نبوی کے علاوہ سب سے پہلا جمعہ اسی مسجد میں ادا ہوا۔ مساجد جہاں عوامی ادارات کی حیثیت رکھتی تھیں وہاں انہیں سرکاری سرپرستی بھی حاصل ہوتی تھی۔ مدینہ سے جن حضرات کو کسی علاقے یا بستی میں سول افسر بنا کر بھیجا گیا وہی وہاں کی مسجدوں کے امام صلوٰۃ بھی ہوتے تھے۔ جو قبائل مدینہ کے ایڈمنسٹریشن سے باہر ہوتے ان کی مسلم آبادی امام کے تقرر کے لیے حضورؐ سے مشورہ لیتی اور پھر حضورؐ کے بتائے ہوئے معیار پر خود کسی آدمی کا انتخاب کر لیتی۔ بہت سی مسجدیں ان تمام تاریخی مقامات پر تعمیر ہوئی ہیں جہاں حضورؐ نے کسی غزوہ یا سفر میں قیام کیا یا نماز ادا فرمائی یا کوئی اہم واقعہ رونما ہوا۔

رسائل و مسائل

غیبت کے مسئلے میں ایک ڈوٹوک بات

سوال:۔ آپ نے جون ۵۹ء کے ترجمان میں غیبت اور اس کے احکام کی جو تشریح کی تھی وہ بڑی تشفی بخش تھی، مگر اس کے بعد پھر کچھ ایسی بحثیں دیکھنے میں آئیں جو ذہن میں الجھن پیدا کرنے والی ہیں۔ کیا آپ اس مسئلے میں کوئی ایسی دوٹوک بات نہیں کہہ سکتے جو دو اور دو چار کی طرح صحیح شرعی پوزیشن کو کھول کر رکھ دے اور پھر آدمی کسی الجھن کا شکار نہ ہو؟

جواب:۔ اس سلسلے کے بعض سوالات کا جواب اس سے پہلے سخت قلبی کراہت کے ساتھ دے چکا ہوں۔ اب اسی کراہت کے ساتھ دو مزید سوالات کا جواب دے کر اپنی حد تک اس بحث کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دینا چاہتا ہوں۔ جس نیچی سطح پر اتر کر یہ بحث کی جا رہی ہے وہ سب کے سامنے ہے۔ خلقِ خدا کو غلط فہمیوں سے بچانے کی خاطر بھی ایک شریف آدمی کے لیے ایسی بحثوں سے تعرض کرنا مشکل ہے۔

جون کے پرچے میں غیبت کی جو تعریف میں نے صحیح احادیث سے نقل کی تھی اسے نکال کر آپ پھر دیکھ لیں۔ یک نظر آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کی رُو سے کسی شخص کے پیٹھ پیچھے اس کے واقعی عیوب بیان کرنا غیبت ہے۔ مگر اس کے برعکس ایک غیر شارع بزرگ اس کی جو تعریف بیان کرتے ہیں اس کی رُو سے یہ بدگوئی صرف اس صورت میں غیبت ہو گی جبکہ تحقیر و تذلیل کی نیت سے کی جائے اور بدگوئی کرنے والے کی خواہش یہ ہو کہ جس کی بدگوئی وہ کر رہا ہے اسے اس کی خبر نہ ہو۔ ظاہر ہے

کہ یہ تعریف دوسرے ائمۂ اہلِ علم کی تعریفات کی طرح شارع کی بیان کردہ تعریف کی تشریح نہیں ہے بلکہ ان دونوں میں کھلا کھلا اصولی فرق ہے جس کی وجہ سے غیبت کے احکام بدل جاتے ہیں۔

اولاً، شارع کی تعریف مطلقاً پیٹھ پیچھے کی بدگوئی کو حرام کرتی ہے۔ مگر غیر شارع کی مذکورۂ بالا تعریف اس حرمت کو صرف اُس بدگوئی تک محدود کر دیتی ہے جس میں تحقیر و تذلیل کی نیت اور اخفا کی خواہش پائی جاتی ہو، باقی تمام بدگوئیاں اس کی رو سے مطلقاً مباح ہو جاتی ہیں۔

ثانیاً، شارع کی تعریف معاشرے کو غیبت کا ایک ایسا معیار دیتی ہے جس کی بنا پر ہر شخص اپنے ماحول میں اس برائی کی روک ٹوک کر سکتا ہے۔ کیونکہ بدگوئی، اور پیٹھ پیچھے، یہ دو اجزاء جہاں بھی جمع ہوں وہاں پر سامع یہ طے کر سکتا ہے کہ یہ غیبت کا ارتکاب ہو رہا ہے۔ لیکن غیر شارع کی تعریف معاشرے کو اس معاملہ سے بالکل بے دخل کر دیتی ہے۔ کیونکہ ایک شخص کی نیت اور خواہش کو دوسرا کوئی بھی نہیں جان سکتا۔ اس کا جج تو بدگوئی کرنے والا خود ہی ہو گا، یا پھر خدا ہو گا جس کا خوف کوئی کرے تو غیبت سے بچے ورنہ اپنی نیک نیتی اور خواہشِ اِخفا سے بے نیازی کا دعویٰ کر کے جس کی غیبت چاہے کرتا پھرے، معاشرے میں کوئی اس کی زبان نہیں پکڑ سکتا۔

ثالثاً، شارع نے پیٹھ پیچھے کی بدگوئی کو اصلاً حرام قرار دینے کے بعد اُسے ان صورتوں میں مباح کیا ہے جبکہ "حق" کی خاطر اس کی ضرورت ہو، یعنی کوئی ایسی ضرورت جو شرعاً ایک صحیح اور قابلِ لحاظ ضرورت قرار پاتی ہو۔ لیکن غیر شارع کی تجویز ایک نوعیت کی بدگوئی کو تو قطعی حرام کر دیتی ہے جس کے مباح ہونے کی کوئی صورت نہیں، اور دوسری نوعیت کی بدگوئی کو مطلقاً حلال کر دیتی ہے جس پر ضرورت یا غرضِ صحیح کی کوئی قید نہیں۔

رابعاً، شارع کی عائد کردہ شرطِ اباحت پھر معاشرے ہی کو اس قابل بناتی ہے کہ اس کے ماحول میں جو بدگوئی بھی کی جائے اسے جانچ کر ہر شخص دیکھ سکے کہ وہ جائز نوعیت کی ہے یا نہیں۔ اس لیے کہ صحیح شرعی غرض یا ضرورت تو ایسی چیز ہے جسے جانچا اور متحقق کیا جا سکتا ہے

بدگوئی کرنے والے سے ہر سامع پوچھ سکتا ہے کہ کسی کے پیٹھ پیچھے اُس کا ذکر جو تم بُرائی کے ساتھ کر رہے ہو اس کی کیا ضرورت ہے، یا اس سے کونسی جائز و معقول غرض اٹکی ہوئی ہے۔ اگر وہ ایک صحیح اور شرعاً معتبر ضرورت یا غرض ثابت کر دے، یا سننے والوں کی سمجھ میں وہ خود آ جائے تو اسے گوارا کیا جا سکتا ہے اور نہ ہر سامع اس سے کہہ سکتا ہے کہ تمہیں اپنے دل کا بخار نکالنا ہے تو اپنے گھر میں جا کر نکالو، ہمیں اس غیبت کے گناہ میں کیوں شریک کرتے ہو۔ لیکن یہ غیر شارع بزرگ ایک طرف تو غیبت کے بضرورت مباح ہونے کا دروازہ بند فرما دیتے ہیں اور دوسری طرف آدمی کو ہر اُس بدگوئی کی کھلی چھٹی دے دیتے ہیں جس کے متعلق وہ یہ دعوٰے کرے کہ میری نیت تحقیر و تذلیل کی نہیں ہے اور میں اخفا کی کوئی خواہش نہیں رکھتا۔ اس کے بعد معاشرے میں کوئی یہ سوال نہیں اٹھا سکتا کہ جناب یہ کام کس ضرورت سے کر رہے ہیں۔

خامساً، شارع کی عائد کردہ شرطِ اباحت کے تحت جو بدگوئی بھی کی جائے گی اس پر وہ تمام حدود و قیود لازماً عائد ہوں گی جو شریعت میں اُن سب کاموں پر عائد ہوتی ہیں جو اصلاً حرام اور بضرورت مباح کیے گئے ہیں یعنی یہ کہ (۱) وہ صرف اُسی صورت میں کیے جا سکتے ہیں جبکہ ان کی حقیقی ضرورت ہو اور اس ضرورت کے لیے ان کے ارتکاب کے سوا چارہ نہ ہو۔ (۲) وہ صرف اُس حد تک کیے جا سکتے ہیں جس حد تک فی الواقع ان کی ضرورت ہو۔ (۳) ضرورت کے رفع ہونے کے ساتھ ہی ان کی اباحت ختم ہو جاتی ہے اور اُن کی حرمتِ اصلیہ اپنی جگہ واپس آ جاتی ہے۔ مثلاً سور اصلاً حرام ہے اور جان بچانے کے لیے شریعت اسے بضرورت مباح کرتی ہے۔ اس اباحت سے صرف بضرورت اور بقدرِ ضرورت اور تا بحدِ ضرورت ہی فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ہر بھوک میں آدمی سور کھانے کے لیے تیار ہو جائے، اور پیٹ بھر کر کھائے اور دوسرے وقت کے لیے اس کے کباب بنوا کر رکھ لے۔ یا مثلاً قتلِ نفس اصلاً حرام اور بضرورت مباح ہے۔ اس کا ارتکاب شرعاً اسی وقت کیا جا سکتا ہے جب کہ پوری احتیاط کے ساتھ اس کے ناگزیر ہونے کا تیقن کر لیا جائے، اور صرف اتنی ہی خونریزی کی جا سکتی ہے جتنی فی الواقع

ضروری ہو، اور ضرورت کے ختم ہوتے ہی لازم ہو جاتا ہے کہ ہاتھ روک لیا جائے۔ ٹھیک یہی قیود غیبت پر بھی عائد ہوں گی جبکہ وہ اصلاً حرام اور بضرورت مباح ہو۔ لیکن غیر شارع بزرگ جس چیز کو غیبت کی تعریف میں داخل فرماتے ہیں اسے وہ کسی ضرورت کی بنا پر مباح نہیں کرتے، اور جسے وہ اس تعریف سے خارج کرتے ہیں اس پر مندرجۂ بالا پابندیوں میں سے کوئی پابندی عائد نہیں ہوتی۔

یہ فرق ہے جو شارع کی تشریع اور غیر شارع کی تشریع سے غیبت کی حقیقت اور اس کے احکام میں صریح طور پر واقع ہو رہے ہیں۔ اب جس کا جی چاہے شارع کی بات مانے اور جو چاہے غیر شارع کی پیروی کرے۔ اس سے پہلے (ماہ جون کی اشاعت میں) ابن حجر اور نووی کی جو عبارات میں نقل کر چکا ہوں ان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلے میں علماء امت نے صحیح شرعی پوزیشن وہی سمجھی ہے جو میں نے بیان کی ہے۔ اور محدثین نے بھی جرح رواۃ کا جو کام کیا ہے وہ یہ سمجھ کر نہیں کیا ہے کہ پاک نیت سے اخفاء کی خواہش کے بغیر ہر شخص کے عیوب ڈنکے کی چوٹ بیان کرتے پھرنا ان کے لیے اصلاً اور مطلقاً مباح ہے، بلکہ انہوں نے اس کام کو اصلاً حرام اور بضرورت مباح مان کر ہی کیا ہے۔ اسی لیے انہوں نے اس کی ضرورت ثابت کی ہے۔ اسی لیے انہوں نے صرف بقدر ضرورت اُن لوگوں پر جرح کی ہے جو احادیث روایت کرتے تھے اور ان کے بھی صرف وہ عیوب بیان کیے ہیں جن کا اثر احادیث کی صحت پر مترتب ہوتا تھا۔ اسی لیے وہ حدِّ ضرورت پر رک گئے ہیں، اس سے تجاوز بالعموم انہوں نے نہیں کیا ہے، اور جس نے بھی تجاوز کیا اس پر دوسرے محدّثین نے نکیر کی ہے۔

رہا کسی شخص کا یہ استدلال کہ فلاں فلاں کاموں کا چونکہ حکم دیا گیا ہے اس لیے اس حکم کی تعمیل میں کسی شخص یا اشخاص کی جو بدگوئی بھی پیٹھ پیچھے کی جائے وہ آپ سے آپ حلال و طیب ہے، بلکہ وہ غیبت کی تعریف ہی سے خارج ہے، تو آپ تھوڑا سا غور کر کے ہی یہ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ سراسر ایک باطل استدلال ہے۔ شریعت کا کوئی ایجابی حکم اس کے کسی امتناعی حکم کو آپ سے

آپ ختم نہیں کر دیتا۔ فرائض و واجبات ہوں یا مستحبات و معروفات، ان کی تعمیل بہرحال انہی طریقوں سے کی جا سکتی ہے جو شریعت نے جائز قرار دیئے ہوں۔ منکرات و ممنوعات کو محض اس دلیل سے مباح نہیں کیا جا سکتا کہ ایک ایجابی حکم کی تعمیل کے لیے یہ کام کیا جا رہا ہے، اور نہ شریعت کے احکامِ امتناعی میں اس طرح کی کوئی ترمیم ہی کی جا سکتی ہے کہ جس فعلِ ممنوع کا ارتکاب کسی ایجابی حکم کی تعمیل کے لیے کیا جائے وہ سرے سے فعلِ ممنوع کے دائرے ہی سے خارج ہے۔ مثال کے طور پر انفاق فی سبیل اللہ کا حکم شریعت نے دیا ہے اور اطعامِ مسکین ایک بڑی نیکی ہے جو شریعت میں مطلوب ہے۔ مگر کیا اس مقصد کے لیے چوری کرنا آپ سے آپ حلال ہو جائے گا اور یہ استدلال صحیح ہوگا کہ یہ فعل سرے سے چوری ہی نہیں ہے کیونکہ اس کا ارتکاب اطعامِ مسکین کے لیے کیا گیا ہے؟ بلاشبہ بعض معروفات کی خاطر ہر منکر کا نہیں بلکہ بعض منکرات کا ارتکاب بعض حالات میں جائز ہے، مگر وہ اس بنیاد پر نہیں کہ اس منکر کا ارتکاب فلاں امر معروف کے لیے کیا جا رہا ہے، بلکہ یہ فعل صرف اُس صورت میں کیا جا سکتا ہے جبکہ ایک معروف کا حصول اُسی منکر پر موقوف ہو، اور اس کی مصلحت اُس منکر کے مفسدے سے زیادہ بڑی ہو، اور اس کا ارتکاب نہ کرنے سے اس معروف کی عظیم تر مصلحت فوت ہو جاتی ہو۔ یہی قاعدہ ہے جو بعض ضرورتوں اور صحیح اغراض کے لیے غیبت کی اباحت میں کام کر رہا ہے۔ شارع نے جہاں کہیں کسی کی غیر موجودگی میں خود اس کی مذمت کی ہے یا دوسروں کو اس کی اجازت دی ہے، وہاں یہی قاعدہ ملحوظ رکھا گیا ہے، بلکہ یہ قاعدہ شارع کے ایسے ہی اقوال و افعال سے مستنبط ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ جب غیبت کو خدا نے حرام کیا ہے اور اس کے رسول نے خود اس کی یہ تشریح کر دی ہے کہ کسی کی غیر موجودگی میں اس کے واقعی عیوب کا بیان، جو اسے ناگوار ہو، غیبت ہے تو یہ حرام فعل مجرد اس بنیاد پر مباح مطلق نہیں ہو سکتا کہ آپ شارع کے کسی دوسرے ایجابی حکم کی تعمیل کے لیے اس کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ تھوڑی دیر کے لیے اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ خاص طور پر راویانِ حدیث ہی کے

عیوب بیان کرنے کا کوئی حکم اللہ اور اس کے رسول نے دیا ہے، جیسا کہ ایک صاحب کو اصرار ہے، تب بھی ایک معمولی منطقی حس رکھنے والا آدمی بھی یہ سمجھ سکتا ہے کہ ایسا حکم لازماً غیبت کی حرمت کے حکم ہی میں ایک استثناء قرار پائے گا اور اس کی وجہ لازماً یہی ہو گی کہ چند زندہ اور مردہ آدمیوں کے عیوب بیان کرنے کا مفسدہ شارع کی نگاہ میں دین کو تحریف سے بچانے کی مصلحت سے کم تر وزن رکھتا تھا۔

بد دیانتی ؟

سوال: " آپ نے ماہ جون ۵۹ء کے ترجمان میں غیبت کے مسئلے پر بحث کرتے ہوئے خطیب بغدادی کی کتاب الکفایہ فی علم الروایہ سے بعض ائمۂ جرح و تعدیل کے جو اقوال نقل کیے ہیں ان کے سلسلے میں ایک بزرگ نے آپ پر بد دیانتی کا الزام لگایا ہے۔ انہوں نے خطیب کی کتاب کے اسی باب کی عبارتیں نقل کر کے بتایا ہے کہ خطیب کا نقطۂ نظر تو آپ کی رائے کے بالکل خلاف ہے مگر آپ نے ان کی وہ ساری عبارات چھوڑ کر اس میں سے صرف اپنے مطلب کے بعض اقوال نکال لیے۔ اس معاملہ میں آپ اپنی پوزیشن واضح کر دیں۔"

جواب: میرے جس مضمون کا آپ حوالہ دے رہے ہیں اسے پھر پڑھ کر دیکھ لیجیے۔ اس میں میں نے کہیں بھی خطیب بغدادی کی آراء سے کوئی استناد نہیں کیا ہے اور نہ ان کو اپنا ہم خیال ظاہر کیا ہے۔ مجھے جب ایک مسئلے کا حکم صاف صاف حدیث میں ملتا ہو تو اس میں خطیب بغدادی، یا ان سے بھی بڑے کسی شخص کی رائے کو آخر میں کیا وزن دے سکتا ہوں۔ میں نے صرف ایک راوی کی حیثیت سے بعض ائمۂ جرح و تعدیل کے اقوال ان کی کتاب سے نقل کیے ہیں۔ ان کی اپنی رائے کو میں سند کے طور پر پیش کرتا تو البتہ یہ بد دیانتی ہوتی۔

مگر جو بزرگ دوسروں پر بد دیانتی کا الزام عائد فرماتے ہیں ان کی اپنی دیانت کے صرف دو نمونے ملاحظہ ہوں۔ یہ دونوں نمونے اسی مضمون میں موجود ہیں جس کا حوالہ آپ دے رہے ہیں۔

انہوں نے علامہ ابن حجرؒ کے متعلق لکھا ہے کہ وہ "اس کے (یعنی غیبت کے) ایک اور پہلو کو کھولتے ہیں، وہ یہ کہ وھوان یذکرہ فی غیبتہ بما فیہ مما یسوءہ قاصدًا بذالک الافساد یعنی اس برائی کے ذکر سے مقصود درحقیقت فساد ڈلوانا ہو۔ دوسرے الفاظ میں اس کو یوں سمجھ سکتے ہیں کہ حافظ ابن حجر غیبت کے غیبت ہونے کے لیے یہ بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ اس کا محرک فاسد ہو۔"

اب ذرا فتح الباری جلد دہم صفحہ ۳۶۱ ملاحظہ فرمائیے۔ اس میں علامہ ابن حجرؒ کی اصل عبارت یوں ہے: الغیبۃ قد توجد فی بعض صور النمیمۃ وھوان یذکرہ فی غیبتہ بما فیہ مما یسوءہ قاصدًا بذالک الافساد ۔ یعنی "غیبت نمیمہ (چغلی) کی بھی بعض صورتوں میں پائی جاتی ہے، اور وہ یہ ہے کہ آدمی دوسرے کے پیٹھ پیچھے اس کا کوئی واقعی عیب فساد ڈلوانے کی نیت سے بیان کرے جسے اگر وہ سنے تو اسے ناگوار ہو۔" اس عبارت میں علامہ موصوف غیبت کی نہیں چغلی کی تعریف بیان کر رہے ہیں اور یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اگر آدمی کے پیٹھ پیچھے محض برائی کے ساتھ ذکر کیا جائے تو یہ غیبت ہے، اور اگر فساد ڈلوانے کے ارادے سے ایسا کیا جائے تو یہ چغلی ہے۔

اس سے بھی زیادہ عجیب نمونۂ دیانت وہ ہے جو انہوں نے ماعز بن مالک اسلمی کے قصے میں پیش فرمایا ہے۔ وہ خود فرماتے ہیں کہ ماعز کا قصہ مسلم کے جس باب (یعنی باب من اعترف علی نفسہ بالزنا) میں آیا ہے اس کی ساری احادیث انہوں نے ملاحظہ فرمائی ہیں اور ان تمام احادیث کے ملاحظہ سے جو کچھ انہیں معلوم ہوا ہے وہ یہ ہے کہ "واقعۂ رجم کے بہت پہلے سے ان کی شہرت بڑی خراب تھی اور وہ اپنی بعض شدید قسم کی کمزوریوں کے باعث نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کی نگاہوں سے بالکل گر چکے تھے لیکن بدکاری کی سزا اسلام میں چونکہ بڑی ہی سخت ہے اس وجہ سے جب تک یہ صاف طور پر قانون کی گرفت میں نہ آگئے اس وقت تک ان کے خلاف نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی کارروائی نہیں کی۔"

اب ذرا مسلم کے اسی باب کو نکال کر دیکھیے جس کا حوالہ دیا جا رہا ہے۔ اس میں ابو سعید خدری

روایت کرتے ہیں کہ جب ماعز نے حضورؐ کے سامنے چار مرتبہ زنا کا اقرار کیا تو آپ نے ان کی قوم سے پوچھا کہ یہ کیسا آدمی ہے۔ انہوں نے کہا مانعلم بہ باساً الا انہ اصاب شیئاً یری انہ لا یخرجہ منہ الا ان یقام فیہ الحد (اس کے اندر کوئی خرابی ہمارے علم میں نہیں ہے۔ بس اس سے کوئی ایسا فعل سرزد ہو گیا ہے جس کے متعلق اس کا خیال یہ ہے کہ وہ اس کے وبال سے نہیں نکل سکتا جب تک کہ اس پر حد جاری نہ ہو جائے)۔ اسی معاملہ کے متعلق عبداللہ بن بُریدہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ماعز کی قوم کے لوگوں سے ان کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے جواب دیا ما نعلمہ الا وفیّ العقل من صالحینا فیما نری (ہم اس کے سوا کچھ نہیں جانتے کہ اس کی عقل بالکل درست ہے اور جہاں تک ہمیں معلوم ہے یہ ہمارے صالح لوگوں میں سے ہے)۔ دوسری مرتبہ پھر آپ نے ان سے دریافت کیا تو انہوں نے عرض کیا لا باس بہ ولا بعقلہ (نہ اس میں کوئی خرابی ہے اور نہ اس کی عقل میں)۔ سوال یہ ہے کہ آخر مسلم کی کس روایت سے صاحب موصوف کو یہ معلوم ہوا کہ ماعز بن مالک کی شہرت پہلے سے بڑی خراب تھی، اور وہ حضورؐ کی اور صحابہ کی نگاہوں سے بالکل گر چکے تھے اور حضورؐ انہیں سزا دینے کے لیے صرف اس بات کے منتظر تھے کہ یہ پوری طرح قانون کی گرفت میں آجائیں؟

یہ پوری عمارت جس بنیاد پر کھڑی کی گئی ہے وہ صرف یہ ہے " اس سزا کے فوراً بعد حضورؐ نے ایک خطبہ دیا جس میں ان کے خراب کردار کی طرف ان الفاظ میں اشارہ فرمایا اَوَکلما انطلقنا غزاۃ فی سبیل اللہ تخلف رجل فی عیالنا لہ نبیب کنبیب التیس۔۔۔ کم و بیش اسی مضمون کی چار روایتیں امام مسلم نے نقل کی ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ ماعز کے اخلاق و کردار کے متعلق صحابہ رضی اللہ عنہم اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے علم میں کیا باتیں موجود تھیں۔"

اوّل تو یہ بات ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت اور مزاج کے خلاف ہے کہ کسی مسلمان کو موت کی سزا دے چکنے کے بعد فوراً ہی اٹھ کر مجمع عام میں اس کی مذمت فرماتے۔ اس لیے سیرت پاک پر معمولی نظر رکھنے والا آدمی بھی حضورؐ کی تقریر کا وہ مطلب نہیں لے سکتا جو

صاحبِ موصوف نے لیا ہے۔ پھر حدیث کے الفاظ بھی اس معاملہ میں واضح نہیں ہیں کہ اس کلام سے مقصود ماعز کی مذمت تھی۔ مسلم کی جن چار روایتوں کا حوالہ دیا گیا ہے ان سب کو پڑھ کر دیکھ لیا جائے۔ ان میں سے کسی میں بھی اشارہ اس طرف نہیں ہے کہ ہر جہاد کے موقع پر ماعز بن مالک ہی وہ شخص تھے جو مجاہدین کے پیچھے ان کی عورتوں کو خراب کرنے کی فکر میں پھرتے رہتے تھے، بلکہ ان سے طرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ زنا کے جرم میں رجم کی پہلی سزا دینے کے بعد حضورؐ نے اپنے خطبے میں مدینے کے اُن لوگوں کو متنبہ کرنا چاہا تھا جو غزوات کے موقع پر مجاہدین کے چلے جانے کے بعد ان کے گھروں کے چکر کاٹا کرتے تھے۔ آپ نے اس نفسیاتی موقع پر جبکہ سارا مدینہ سنگساری کی اس ہولناک سزا پر لرز اٹھا تھا اُن کو نوٹس دیا کہ اب یہاں یہ سخت فوجداری قانون نافذ ہو چکا ہے، آئندہ جو شخص بھی یہ حرکت کرے گا اسے وہی سزا دی جائے گی جو آج ماعز کو دی گئی ہے۔ صرف اتنی سی بات کہ حضورؐ نے تَخَلَّفَ رَجُلٌ کے الفاظ استعمال کیے تھے، یہ نتیجہ نکالنے کے لیے کافی نہیں ہے کہ اس رَجُلٌ (ایک شخص) سے مراد ماعز ہی تھے۔ دوسری روایات میں اَحَدُهُم یا اَحَدُکُم (ان میں سے یا ان لوگوں میں سے کوئی شخص) کے الفاظ آئے ہیں۔ اور ماعز کے متعلق پورے ذخیرۂ حدیث و رجال میں کہیں بھی یہ مذکور نہیں ہے کہ وہ اس طرح کے اوباش لوگوں میں سے تھے۔ اس کے برعکس ان کے حق میں تو ان کی قوم کی ثبت شہادت یہ موجود تھی کہ وہ ایک صالح آدمی ہیں اور احیاناً ان سے ایک گناہ سرزد ہو گیا ہے۔ اسی بنا پر محدثین نے ان کو صحابہ میں شمار کیا ہے اور ان کے سزا یافتہ ہونے کے باوجود عبداللہ بن ماعز کے واسطے سے ان کی روایتِ حدیث قبول کی ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اگر وہ ایک اوباش آدمی ہوتے اور مجاہدین کے پیچھے ان کی عورتوں کی عصمت کے درپے رہنے والے ہوتے تو انہیں صحابی ماننے اور ان کی روایت قبول کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا تھا

آگے چل کر ارشاد ہوتا ہے "ماعز کے رجم کے بعد صحابہ رضی اللہ عنہم دو گروہوں میں بٹ گئے۔ ایک گروہ کی رائے یہ تھی کہ اس شخص کے گناہوں نے اس کو اس طرح اپنی لپیٹ

میں لے لیا کہ آخرکار یہ شخص تباہ ہو کے رہا۔ ان لوگوں کے نزدیک ماعز کے اقرارِ جرم اور ان کے اظہارِ توبہ کی کوئی اہمیت نہ تھی، اُن چیزوں کو یہ لوگ آب از سر گزشت کے بعد کی بے سود باتیں سمجھتے تھے اور ماعز کے خلاف ان لوگوں کو جو غصہ تھا اس پر وہ بدستور قائم تھے۔"

اس عمارت کی بنیاد حدیث کی جس عبارت پر رکھی گئی ہے وہ صاحبِ موصوف نے خود نقل فرمائی ہے کہ قائل یقول لقد ھلک لقد احاطت بہ خطیئتہ۔ اس کا صحیح ترجمہ تو یہ ہے کہ "کوئی کہتا تھا یہ شخص ہلاک ہوگیا۔ اس کو اس کے گناہ نے اپنی لپیٹ میں لے لیا" لیکن موصوف نے اس کا ترجمہ یہ فرمایا ہے "ایک گروہ کہتا تھا یہ شخص برباد ہوگیا، اس کو اس کے گناہوں نے اپنے گرداب میں لے لیا" خطیئہ کا ترجمہ "گناہ" کیا جاتا تو یہ نظریہ ٹھیر نہ سکتا تھا کہ ماعز پہلے سے سخت بدکار آدمی تھے اور صحابہ ان کے خلاف غصے میں بھرے بیٹھے تھے۔ اس لیے اس کو خطایا فرض کر کے ترجمہ "گناہوں" کر دیا گیا تاکہ اس جرم زنا کے بجائے بہت سے اس طرح کے جرائم اس صحابی کے ذمہ ڈالے جائیں جس کے مغفور اور جنتی ہونے کی خبر خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے اور جس غریب کو دنیا سے رخصت ہوئے آج پونے چودہ سو برس گزر چکے ہیں۔

اس کے بعد جن لوگوں نے ماعز کے بارے میں یہ رائے زنی کی تھی کہ "اس شخص کو دیکھو، اللہ نے اس کا پردہ ڈھانک دیا تھا مگر اس کے نفس نے اس کا پیچھا اس وقت تک نہ چھوڑا جب تک یہ کتے کی موت نہ مار دیا گیا" ان کے بارے میں فرمایا جاتا ہے "ان کی رائے زنی کی نوعیت ہمدردانہ اظہارِ افسوس کی نہیں تھی بلکہ یہ لوگ جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، ماعز کی پچھلی خراب شہرت کی بنا پر ان کے بارے میں نہایت سخت رائے رکھتے تھے اور ان کے اعترافِ جرم کے معاملے کو کوئی اہمیت نہ دیتے تھے ... اس وجہ سے زیرِ بحث رائے زنی میں صرف تحقیر و تذلیل ہی کا جذبہ نہیں بلکہ نہایت شدید قسم کی نفرت و بیزاری کا جذبہ بھی موجود ہے۔"

اس زیرِ بحث رائے زنی کے الفاظ آپ کے سامنے موجود ہیں۔ کیا ان سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ماعز کی خراب شہرت کی بنا پر ان کے بارے میں نہایت سخت رائے رکھتے تھے اور ان سے

سخت متنفر اور بیزار تھے، اور یہ سمجھتے تھے کہ ایسے بُرے آدمی کا یہی انجام ہونا چاہیے تھا؟ اگر ان کے جذبات یہی ہوتے تو انہیں یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی کہ اس شخص کا پردہ اللہ نے ڈھانک دیا تھا مگر یہ نہ مانا؟ ان الفاظ کا مطلب آخر اس کے سوا اور کیا ہے کہ وہ چاہتے تھے کہ جب اللہ نے اس کا پردہ ڈھانک دیا تھا اور کوئی شہادت اس کے خلاف موجود نہ تھی تو یہ اس پردے کو ڈھکا رہنے دیتا اور خواہ مخواہ بار بار اعترافِ جرم کر کے سزا نہ پاتا۔ کیا اس شخص کے سزا سے بچ جانے کی یہ خواہش جو ان کے الفاظ سے ظاہر ہو رہی ہے ان لوگوں کے دل میں اس لیے تھی کہ وہ ماعز کی پچھلی بدکاریوں کے باعث ان سے سخت بیزار تھے اور مطمئن تھے کہ یہ شخص ٹھیک کیفرِ کردار کو پہنچ گیا؟

میں اس کارنامے پر کوئی تبصرہ نہیں کرنا چاہتا۔ آپ خود دیکھ سکتے ہیں کہ محض اپنے ایک نظریہ کو سہارا دینے کے لیے کس طرح ایک پوری داستان گھڑ دی گئی ہے اور صحیح مسلم کو آڑ کا بنا کر ایک صحابی تک کو بدترین الزامات کا ہدف بنا دینے میں تأمل نہیں کیا گیا ہے۔ اس کے بعد تو ہر اس الزام پر آدمی کو صبر کرنا ہی چاہیے جو صاحبِ موصوف کی طرف سے اس پر لگایا جائے۔

مطبوعات

ارکانِ اسلام | تالیف: مولانا عبید الحق۔ قیمت پانچ روپے۔ طابع و ناشر: المکتبۃ العلمیہ ۱۵۔ لیک روڈ، لاہور۔ صفحات ۵۵۲۔ کتابت اور طباعت عمدہ۔

یہ کتاب ہائی سکول کے طلبہ و طالبات کے لیے مرتب کی گئی ہے۔ فاضل مصنّف نے اس میں بڑے دلنشین انداز میں اسلام کی بنیادی تعلیمات کی وضاحت فرمائی ہے۔ عقائد سے لیکر نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ سب موضوعات بڑی تفصیل سے زیر بحث آگئے ہیں۔ البتہ کہیں کہیں عنوانات کی ترتیب ضرور کھٹکتی ہے مثلاً جنت اور دوزخ کے بیان کے بعد، طہارت کا بیان شروع ہوتا ہے۔ پھر رسالت کے باب میں اگر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس پر ذرا زیادہ مکمل کر بحث کر دی جاتی تو اس سے کتاب کی افادیت میں یقیناً اضافہ ہوتا۔ اسی سلسلہ میں عقیدۂ ختمِ نبوت کی وضاحت بھی بڑی ضروری تھی۔ ہمیں امید ہے کہ فاضل مصنف نقشِ ثانی کے وقت ہماری ان گزارشات کو پیشِ نظر رکھیں گے۔ کتاب بہر حال بڑی قابلِ قدر ہے اور اس سے نہ صرف طلبا اور طالبات بلکہ عام مسلمان بھی کافی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ کتاب کے سارے مبحث قرآن و سنت سے ماخوذ ہیں۔ فاضل مصنف نے اس میں کوئی بات ایسی نہیں لکھی جو اہلِ سنت کے مسلک سے ہٹی ہوئی ہو۔

ان دیکھی حقیقتیں توحید، رسالت، آخرت | تالیف: محترم کوثر نیازی صاحب۔ طابع و ناشر آئینہ ادب، چوک مینار، انارکلی۔ لاہور۔ قیمت ۲/۸ روپے۔ صفحات ۱۹۲۔ کتابت و طباعت نہایت عمدہ۔

محترم کوثر نیازی صاحب نے اس مختصر کتاب میں توحید، رسالت اور آخرت کے متعلق اسلامی عقائد کی تشریح و تفہیم فرمائی ہے۔ فاضل مصنف کے پیشِ نظر چونکہ جدید تعلیم یافتہ

طبقہ ہے اس لیے انہوں نے وہی انداز بیان اختیار فرمایا ہے جو اس طبقے کو مطمئن کر سکے انہوں نے اس تصنیف کو فلسفیانہ موشگافیوں اور کلامی طرز کی بحثوں میں نہیں الجھایا بلکہ قرآن و سنت کے صاف و سادہ طریقے سے اسلام کے ان اساسی تصورات کی وضاحت کی ہے اور اس اعتبار سے یہ ایک کامیاب کوشش ہے۔ ہم اپنے نوجوانوں سے اس قابل قدر تصنیف کے مطالعہ کی پرزور سفارش کرتے ہیں۔

واقعۂ کربلا | تالیف۔ پروفیسر سید ابوبکر غزنوی ایم، اے، ایل، ایل، بی۔ ناشر، المکتبۃ العلمیہ ۱۵۔لیک روڈ، لاہور۔ صفحات ۴۶۔ قیمت دس آنے۔

اس فاضلانہ مقالہ میں پروفیسر سید ابوبکر غزنوی صاحب نے نہایت عمدہ سلیقے سے کربلا کے جاں گداز واقعات کو جمع کر دیا ہے۔ انہوں نے سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے موقف کی تائید میں بڑے مستند دلائل پیش کیے ہیں اور ناقابلِ تردید شواہد کی مدد سے یہ ثابت کیا ہے کہ حضرت حسین کی کوفہ میں آمد کسی جاہ طلبی کا نتیجہ نہ تھی بلکہ اس کے پیچھے صرف ایک جذبہ ہی کارفرما تھا کہ اسلامی حکومت کو غلط ہاتھوں میں منتقل ہونے سے جہاں تک ممکن ہو روکا جائے۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے اپنے گھرانے کا ایک ایک فرد اپنی آنکھوں کے سامنے کٹوا دیا۔ انہوں نے اپنے بچوں کو خاک و خون میں تڑپتا ہوا دیکھا اور بالآخر اپنی جان بھی اس راہ میں قربان کر دی مگر ان کے پائے استقلال میں کوئی لغزش نہ پیدا ہوئی۔ ہم اپنے قارئین سے اس مقالہ کے مطالعہ کی سفارش کرتے ہیں۔ طباعت و کتابت کا معیار گوارا ہے۔

پیارے نبی کی پیاری زبان۔ ۲۴ حصے | ملنے کا پتہ: انجمن ترقی عربی ۶۴ ڈی گلبرگ لاہور۔ قیمت ہر حصہ ۸ آنے۔

عربی زبان کو آسان طریقہ سے سکھانے کا یہ ایک سلسلہ ہے جو ۲۴ حصوں پر مشتمل ہے اور جسے انجمن ترقی عربی (پاکستان) کے بانی جناب عبدالرحمٰن طاہر سورتی نے مرتب کیا ہے معلوم نہیں اب تک اس کے کل کتنے حصے شائع ہو چکے ہیں، اس وقت ہمارے سامنے اس کے پہلے

چھ حصّے ہیں۔ ہر حصہ چھ یا سات ابواب پر مشتمل ہے۔ ہر باب میں پہلے عربی زبان کے قواعد بتائے گئے ہیں اور پھر آخر میں عربی سے اُردو اور اردو سے عربی میں ترجمہ کرنے کے لیے مشقیں دی گئی ہیں۔ ان چھ حصّوں کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ بہرحال یہ ایک کامیاب سلسلہ ہے جس سے عام اُردو دان حضرات اپنی دوسری مصروفیات کے ساتھ ساتھ ہر روز پندرہ بیس منٹ کا وقت نکال کر فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور اس طرح چھ ماہ میں (اگر ہر روز ایک سبق پابندی سے پڑھا جائے) اس قابل ہو سکتے ہیں کہ قرآن و حدیث کا براہِ راست مطالعہ کر سکیں۔ عربی فقروں میں اگرچہ کہیں کہیں زبان کی غلطیاں نظر آتی ہیں لیکن بہرحال یہ غلطیاں سخت نوعیت کی نہیں ہیں۔ امید ہے اگر مؤلف اگلے ایڈیشن کے وقت قدرے اہتمام اور وقتِ نظر سے کام لیں تو خود ہی ان غلطیوں کو درست کریں گے۔ البتہ چند باتیں ہم ان سے ضرور عرض کر دینا چاہتے ہیں۔ ایک یہ کہ انہوں نے اس سلسلہ میں تدریج کا بہت کم خیال رکھا ہے۔ جس معیار کے فقرے ترجمہ کے لیے پہلے حصہ میں دیئے گئے ہیں، چھٹے حصہ میں بھی تقریباً اسی معیار کے فقرے پائے جاتے ہیں۔ دوسرے عربی جملے چونکہ انہوں نے خود بنائے ہیں اس لیے ان پر کہیں کہیں اردو اسلوبِ بیان کی جھلک پائی جاتی ہے۔ بہتر ہوتا کہ وہ محنت کر کے تمام فقرے قرآن حدیث اور ادب کی معتبر کتابوں سے اخذ کرتے تاکہ پڑھنے والے کے ذہن پر شروع ہی سے عربی اسلوب نقش ہو جاتا۔ تیسرے یہ کہ انہوں نے قواعد بیان کرتے ہوئے بعض ایسی باتوں کو جن سے ناظرۂ قرآن پڑھنے والا ہر شخص یا تو واقف ہوتا ہے، یا پڑھتے وقت استاد سے ضمنی طور پر معلوم کر ہی لیتا ہے، بہت زیادہ تفصیل، اہتمام اور تکرار سے بیان کیا ہے جس کی وجہ سے یہ سلسلہ بلا وجہ زیادہ لمبا ہو گیا ہے ہمارا خیال ہے کہ اگر وہ اس قسم کی باتوں کو بڑی حد تک حذف کر دیتے تو یہ سلسلہ زیادہ مفید بھی رہتا اور عام لوگوں کے لیے اسے خریدنا اور پڑھنا زیادہ آسان بھی ہوتا۔ (محمد عاصم)

(بقیہ اشارات)

اگرچہ زبان اور رسم الخط کی اہمیت پر بہت سی ایسی شہادتیں بھی نقل کی جا سکتی ہیں جو علمی حیثیت سے

خـــالی صفحـــه

اس کتاب میں مولف نے سیرت نگاری کی نئی راہ نکالی ہے اور روایاتی الجھنوں اور لاطائل بحثوں کے تمام غبار ہٹا کر حضور کی شخصیت کو ماہ درخشاں کی طرح نمایاں کر دیا ہے۔ اسکے مطالعہ سے یہ شعور حاصل ہوتا ہے کہ حضور کی سوانح ایک فرد کی داستان نہیں بلکہ عظیم ترین تاریخی قوت کی روداد ہے جس نے اجتماعی تحریک کے روپ میں جلوہ گر ہو کر تہذیب کی کایا پلٹ دی۔



ملنے کا پتہ

ادارۂ ترجمان القرآن

اچھرہ - لاہور